اردو افسانے میں خانگی زندگی کی عکاسی

مقالہ برائے ایم فل

مقالہ نگار

غلام صمدانی

نگراں

ڈاکٹر مظہر مہدی حسین

ہندوستانی زبانوں کا مرکز

اسکول آف لینگویج، لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز

جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔ 67

2011

Centre of Indian Languages

School of Language, Literature & Culture Studies

JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY

New Delhi - 110067

Date: 25/07/2011

DECLARATION

I declare that the dissertation entitled **Urdu Afsane Mein Khangi Zindagi Ki Akkasi** ***(Reflection of Family Life In The Urdu Short Story)*** submitted by me in partial fulfillment of the requirement for the award of the degree of **MASTER OF PHILOSOPHY** of Jawaharlal Nehru University is my own work. The dissertation has not been submitted for any other degree of this university or any other university.

Ghulam Samdani

Ghulam Samdani

Krishnaswamy Nachimuthu

(chairperson)

Dr.Mazhar Mehdi Hussain

(supervisor)

فہرست

ابتدائیہ 2-4

باب اوّل 5-25

جدید ہندوستان میں خانگی زندگی کی ہیئت وساخت اور ارتقا

باب دوم 26-55

اوّلین دور کے اردو افسانوں میں خانگی زندگی کی عکاسی

(بدلتے ہوئے سماجی وتہذیبی اقدار اور خاندانوں میں پیدا ہونے والی کش مکش)

باب سوم 56-96

ترقی پسند افسانوں میں خانگی زندگی کی عکاسی

(الف) روایتی اقدار سے گریز

(ب) ہجرت سے پیدا شدہ بکھراؤ

باب چہارم 97-126

جدید اور مابعد جدید افسانوں میں خانگی زندگی کی عکاسی

(الف) شہری اور دیہی اختلاط اور خاندان

(ب) نیوکلیر فیملی کا تصور اور اس کے اقدار

خاتمہ 127-129

کتابیات 130-135

ابتدائیہ

اس مقالے میں جدید ہندوستان کی تاریخ میں سماج کے مختلف اداروں یا اکائیوں کے اندر پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ صرف اس کی ایک اکائی یعنی خانگی زندگی کے حوالے سے لیا گیا ہے۔ اگر چہ اس میں تاریخ اور سماجیات کے نقطۂ نظر سے بھی کام لینے کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن ہمارا دائرۂ کار ادب تک ہی محدود ہے اس لئے ہم نے اردو افسانوں میں خانگی زندگی کی بدلتی قدروں کو تحقیقی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ دیکھانے کی بھی کوشش کی ہے کہ اردو کے افسانہ نگاروں نے جدید ہندوستان میں خانگی زندگی کی بدلتی قدروں، اس میں ہونے والی کشمکش اور انتشار کی عکاسی میں فنی لوازمات کو کس طرح برتا ہے۔ یہ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے تیسرے اور چوتھے باب میں ذیلی دو عنوان بھی شامل ہیں۔

باب اول میں **''جدید ہندوستان میں خانگی زندگی کی ہیئت و ساخت اور ارتقا''** کا تاریخی اور سماجی حیثیت سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس عہد کے خاندان میں ہونے والی تبدیلیوں کے تناظر میں اس کو زیر بحث لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ خاندان کی مختلف شکلوں کا تعارف اور اس کی تعمیر و تشکیل کے اسباب و عوامل کی نشاندہی میں تاریخ اور ادب کے تسلسل کو برقرار رکھا گیا ہے۔ اگر چہ اس کی واضح شکلوں کا تعارف میرے لیے ایک دشوار گزار امر تھا کیوں کہ خاندان کی تمام شکلیں انسانی اور تہذیبی ارتقا کے ابتدائی دور سے لیکر اب تک کسی نہ کسی طرح باقی ہیں۔ پھر بھی میں نے ان کی سمٹتی اور بکھرتی ہوئی ہیئت و ساخت اور ان کے فرائض اور ذمہ داریوں میں آنے والی تبدیلیوں کے واقعات و امکانات کو اس باب میں اجاگر کیا ہے۔

باب دوم کے تحت **''اردو کے اولیں دور کے افسانوں میں خانگی زندگی کی عکاسی''** کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس میں بیسویں صدی کے آغاز میں ''بدلتی ہوئی سماجی اور تہذیبی قدروں اور خانگی زندگی میں پیدا ہونے والی کشمکش'' کو متعدد افسانہ نگاروں کے تخلیقات میں تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب سوم: **''ترقی پسند اردو افسانوں میں خانگی زندگی کی عکاسی''** کے موضوع کے تحت دو ذیلی عنوان آتے ہیں۔ (الف اور ب) الف کے تحت سماج کے اندر **''روایتی اقدار سے گریز''** کے باعث خاندان کے نظم و ضبط میں آنے والی تبدیلیوں کو اس دور کے افسانوی تخلیقات میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے بکھراؤ کی صورت حال

کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ب: کے تحت ''**ہجرت سے پیدا شدہ خانگی زندگی کے بکھراؤ**'' کی نوعیت کا اندازہ وقدر اس دور کے افسانوں کے ذریعے کیا گیا ہے اور افسانہ نگاروں نے حقیقت نگاری سے کتنا کام لیا ہے اس کو ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔ اس میں وہ افسانیں آ جاتے ہیں جن میں تقسیم ہند اور فسادات کی خوں چکاں داستانوں کا ذکر ہے۔ جب دونوں ملکوں کے حالات بد سے بدتر ہو گئے تھے، بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا تھا، عورتوں کے ساتھ وحشیانہ زیادتیاں کی جا رہی تھیں، بیشتر خاندان کے کچھ نہ کچھ افراد ہجرت کی کرب ناکیوں میں مبتلا تھے، جب ہندو مسلم قوم تباہ ہو رہی تھی اور جو بچ گئے تھے ان کی جائداد اور خاندان پوری طرح بکھر چکے تھے۔

باب چہارم: ''چھٹی دہائی کے بعد کے افسانوں میں خانگی زندگی کی عکاسی'' پر مبنی ہے۔ اس میں دو ذیلی ابواب ہیں، پہلے ذیلی باب ''**شہری اور دیہاتی اختلاط اور خاندان**'' کے تحت ہندوستان کی جدید صنعتی انقلاب اور ملازمت کی وجہ سے شہر اور دیہات میں پیدا والے اختلاط اور اس کی وجہ سے صنعتی مزدور اور متوسط طبقوں کی شہر کی جانب ہجرت کے واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ ان میں وہ افسانہ نگار شامل ہیں جن کے افسانوں میں خاندان کے بکھرنے کا جائزہ شہری اور دیہاتی تہذیب وروایت کیا ختلاط کے تناظر میں لیا گیا ہے۔ دوسرے ذیلی باب میں ''**نیوکلیر فیملی کا تصور**'' اور اس کی طرف لوگوں کے بڑھتے رجحان کی وجہ سے ان میں جو پیچیدگیاں آ رہی تھیں ان کو ان افسانوں میں تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

خدائے بزرگ وبرتر کا جس نے مجھے زندگی بخشی۔ شکر نبی آخر الزماں کا جنہوں نے ضابطہ حیات عطا کیا۔

میں استاد گرامی ڈاکٹر مظہر مہدی کا بے حد ممنون ہوں، انہوں نے ہر مرحلہ پر میری ہمت افزائی اور رہنمائی فرمائی ہے۔ موضوع کے انتخاب اور ابواب کی ضابطہ بندی سے لے کر اختتام تک انہوں نے منتخبہ موضوع کے مختلف گوشوں اور اس کی باریکیوں سے مجھے روشناس کراتے ہوئے نیک مشوروں سے نوازہ ہے۔ خاص کر مواد کی حصولیابی میں انہوں نے کافی مدد کی ہے ان کے تعاون، پدرانہ شفقت اور استدلالی قوت کا نتیجہ ہے کہ ناچیز کم مائیگی اور کم علمی کے باوجود مقالے کو آخری شکل دینے میں کسی طرح کامیاب ہوا ہے۔ میں اپنے دل میں موجزن عزت واحترام کے جذبہ کے ساتھ ان کا مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میں اپنے سینٹر کے دیگر اساتذہ کرام جناب پروفیسر محمد شاہد حسین، پروفیسر معین الدین جینا بڑے، ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین اور ڈاکٹر انوار عالم پاشا کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں، کہ ان کی صحبت اور درس نے ادبی سمجھ اور تحریری سلیقہ عطا فرمائی ہے۔

دادی جان کا شکریہ، کہ جن کی بوڑھی ہتھیلیوں میں میرے حق میں کی گئی دعاؤں کے ذخیرے آج بھی آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں اور جو ہمیشہ میرے حوصلوں کو طاقت پرواز عطا کرتی ہیں۔

ابا حضور، جناب محمد جمیل انصاری اور محترمی امی جان زبیدہ خاتون کا دل و جان سے شکریہ، کہ ان کی محبتوں اور دعاؤں کے طفیل میں اب تک تعلیمی کڑیوں سے منسلک ہوں۔ ساتھ ہی اپنے تمام بھائیوں اور بہنوں کا شکریہ جن کی محبتوں کی روشنی اور ڈھیر سارے میٹھے بول کی مہک میرے ہمراہ ہیں اور ہر گام پہ رہنمائی اور ذہن و دماغ کو معطر کرتی ہیں۔

اپنی مخطوبہ طلعت فاطمہ کی ''جنون زلیخائی'' کا شکریہ، جس کی یادوں اور تمناؤں کی کسک ہمیشہ مجھے کچھ کرنے کا جذبہ فراہم کرتی رہی ہے۔

میں اپنے کزن ڈاکٹر تبریز عالم کا شکر گذار ہوں جو لندن میں طبی پیشہ سے وابستگی اور مصروفیتوں کے باوجود ہندوستان کی سماجی اور خانگی زندگی کی قدروں سے نہ صرف وابستہ ہیں بلکہ ان کی گہرائیوں تک بھی رسائی رکھتے ہیں۔ جس کا اظہار وہ دوری کے باوجود ٹیلی فونک گفتگو میں کرتے رہے اور میرے محشر خیالی کی شیرازہ بندی فرماتے رہے۔

آخر میں میں اپنے تمام دوستوں کا شکریہ محبتوں کے ساتھ کرتا ہوں کہ جناب اشرف صاحب نے کمپوزنگ کے ذریعہ اس مقالے کی تشکیل و تجمیل کا عمدہ کارنامہ انجام دیا۔ عزیز منہاج سلمہ جس نے ہمارے بکھرے ہوئے صفحات کو یکجا کر کے خوش نویسی سے مزین کیا۔ جناب مہتاب عالم، امتیاز عالم، ہاشم رضا، مولانا ابرار احمد، نیاز احمد، نعیم احمد، غلام مرتضی اور دیگر تمام دوستوں کا ایسے وقت میں انکی عنال کی گہرائیوں سے مکرر شکریہ، کہ سبھی نے اس اہم گھڑی میں گوناگوں طریقے سے مدد کی، اس مشکل گھڑی میں ان کی عنایتیں نہ ہوتیں تو تحقیقی مراحل کی دشواریوں میں سہل انگیزی کے آثار ممکن نہ تھے۔

غلام صمدانی

باب اوّل

جدید ہندوستان میں خانگی زندگی کی ہیئت وساخت اور ارتقا

جدید ہندوستان میں خانگی زندگی کی ہیئت وساخت اور ارتقا

ہندوستان کی تاریخ نقل مکانی کرنے والوں کی ایک تاریخ ہے۔ وسطی ایشیا، مغربی ایشیا اور جنوبی مشرقی ایشیا کے نقل مکانی کرنے والے لوگ اس کے گواہ ہیں۔ ملک، سماج، خاندان اور افراد کی تعمیر وتشکیل میں بہت حد تک تاریخی عوامل کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ ہندوستانی سماج، خاندان اور افراد بھی اس تاریخی شکست وریخت کے مرحلے سے بار بار گزرے ہیں اور اس تاریخی سفر کی داستان جس قدر ملک اور سماج کے دوسرے اداروں سے مربوط ہے اسی طرح خانگی زندگی اور اس کے قدروں کی تبدیلیوں کے مطالعہ سے بھی وابستہ ہے۔

ہندوستان کی تاریخ کی روشنی میں اگر خانگی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ ہندوستانی سرزمین کے سبھی علاقے ہمیشہ سے ہی زرخیز رہے ہیں۔ انسانی جماعت کی آمدورفت کا سلسلہ برابر قائم رہا ہے۔ قدیم ہندوستان کی تاریخ میں آریائی قوم کی آمد، عہد وسطی میں مسلم حکمرانوں کے دخول اور ان کی شکست وریخت اور جدید ہندوستان کی تاریخ میں انگریزوں کی آمد اور ان کے غلبے کی کہانیاں ادب اور تاریخ کے صفحات میں بکھرے پڑے ہیں۔

غیر ملکی افراد وافواج اور عوام وحکمراں کی آمد سے جس طرح ہندوستان کی سیاسی حالات میں تبدیلیاں رونما ہوئیں اسی طرح سماجی اور خانگی طرز زندگی میں بھی بدلاؤ کی کئی صورتیں پیدا ہوئیں کیونکہ قدیم، وسط اور جدید تینوں عہد میں آنے والوں کے مقاصد جو بھی رہیں ہوں انہوں نے یہاں آکر اقتدار کی حصولیابی کے کامیاب حربے اپنائے اور فتح ونصرت حاصل کر کے مفتوح قوم کے سماج وخاندان، حکومت وریاست اور فرد وجماعت کے ہر گوشے میں اپنے گہرے اثرات مرتب کئے۔ ہندوستان مزاحمت ومفاہمت کی اس جنگ میں ہر طرح کے عمل اور ردعمل سے دوچار ہوا اور تہذیبی، سیاسی، مذہبی، معاشرتی، اخلاقی، فکری، تمدنی، آبادکاری، خانگی اور معاشی نظم وضبط کے نئے نئے طریق عمل سے آشنا بھی ہوا۔ ان ساری تنوعات کی وجہ سے ہندوستانی مزاج میں ترک واختیار کی قوت پیدا ہوئی اور تہذیبی تکثیریت، متوازن روایت واقدار اور سماجی وخانگی نظام حیات کے نمونے قائم ہوئے اور ان میں عہد بہ عہد تبدیلیوں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

جدید ہندوستان کی تاریخ میں خاندان کی ہیئت و ساخت اور ارتقاء کی صورت حال کیا رہی، 1602 سے انگریزوں نے جب سیاسی مداخلت شروع کی تھی اس وقت سے لے کر 1947 تک کس طرح مغربی تہذیب وثقافت روز بہ روز ہندوستان کی خانگی زندگی میں اثر انداز ہوتی رہیں اور ان اثرات کے نتیجے میں 1947 سے لے کر اب تک کے خاندانی نظم وضبط میں تبدیلیوں کا سلسلہ کیسے جاری رہا اور اس کی نوعیت کیا تھی؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کے جواب تقریباً ہندوستان پر برطانوی سامراج کے اقتدار کی ساڑھے تین سو سالہ تاریخ کو محیط ہیں۔ اس باب میں اس کا اجمالی خاکہ ادبی اور تاریخی حوالے سے پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی تاکہ جدید ہندوستان میں خانگی زندگی پر تبصرہ کرنے اور اس دور کی خانگی زندگی کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہو۔ کیوں کہ خاندان کی موجودہ شکل یقیناً ایک لمبی تاریخی سفر کا نتیجہ ہے۔ یہ سفر ہزاروں، لاکھوں سال پرانا بھی ہوسکتا ہے اسلئے کہ تاریخ کے ابتدائی دور میں خاندان کا رواج واضح شکل میں موجود تھا کہ نہیں اس بارے میں بہت سارے مورخین کے خیالات کی حتمی صورت نہیں دکھائی دیتی۔

انسانی تاریخ کے ابتدائی دور میں جب رشتے کی کوئی شکل نہیں تھی، مرد وزن انفرادی طور پر رہتے تھے اس وقت باپ کی حیثیت کی شناخت ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ بچے اپنی ماں کے ساتھ رہا کرتے تھے حتی کہ وہ اس قابل ہوجائیں کہ اپنی دیکھ بھال خود کرسکیں۔ باپ کی حیثیت محض رسمی اور ضمنی ہوتی تھی۔ ماں ہی وہ ہستی تھی جن کا بچوں پر سارا عمل دخل ہوتا تھا۔ عورت اس بات پر اصرار بھی نہیں کرتی تھی کہ بچے یہ معلوم کریں کہ اس کے بچے کا باپ کون ہے وہ اپنے بچوں کو ماموں وغیرہ سے قریب تر کرتی تھی۔ ماں کے لئے دنیا میں عزیز ترین اور قریب ترین ہستی اس کا بھائی ہوتا تھا۔ آج بھی یہ تصور ہے کہ بیوی کے لئے شوہر عزیز ترین فرد ہے۔ ہمارے خیال سے یہ صرف ایشیائی ممالک کی پیداوار ہے اور اگر دنیا کے اکثر حصوں میں بیوی اور شوہر کی قربت کا یہ تصور ہے بھی کہ بیوی کا اصل مرجع شوہر ہے، بھائی کا درجہ اس کے نزدیک کم تر ہے تو یہ محض رواج تک محدود ہے، ورنہ جب رواج کے اس بندھن سے کسی طرح بکھراؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے تو بیوی کی پہلی پناہ گاہ اس کا بھائی یا اس کے والدین ہی ہوتے ہیں۔ لیکن قدیم ہندستان کے روایتی سماج اور خاندان کی تہذیب واقدار کی روشنی میں ازدواجی رشتے کا مفہوم دیگر ممالک سے الگ ہے، شوہر و بیوی کے رشتے کی بندھن حتمی ہوتی تھی یہاں تک کہ دونوں کی سانسوں کی حرکت ورفتار بھی یکساں تھی۔ 'ستی' کی رسم سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہندستان میں ازدواجی زندگی کا مضبوط رشتہ خانگی زندگی کے مستحکم ہونے کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے۔

اب بھی دور افتادہ علاقوں کے قبیلے، افریقہ وغیرہ کے بہت سارے معاشرے، خاندان کے ترقی یافتہ نمونوں سے بے خبر ہیں اور ان کے یہاں بیوی، شوہر، بچے، والدین اور دیگر رشتے داروں کے درمیان تعلقات اور روایت کی

غیر ترقی یافتہ شکلیں موجود ہیں۔ اگر چہ زمانہ قدیم کے بے ترتیب معاشرے میں ترتیب کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے اور عہد بہ عہد تعمیر وتخریب کی کشمکش مسلسل قائم رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں خانگی زندگی کی روایت ایک مدت سے انتشار کی شکار ہے۔ انسانی رشتے کی نوعیت ایسی ہے کہ ان کی زندگیاں خوش حالی کے باوجود طمانیت سے عاری نظر آتی ہیں۔ ان کے تجربات نے ایسے ایسے معروضات ونظریات قائم کئے ہیں کہ آسودگی کے باوجود رشتے اور خاندان کے حصار ٹوٹ چکے ہیں۔

ہندستان میں خاندان کے قیام کا عمل تدریجی طور پر ہوا ہے۔ (موجودہ دور میں بھی خاندانی نظم وضبط کے عمدہ نمونے پائے جاتے ہیں۔) انسان جب تہذیبی اور تمدنی دور میں داخل ہوا اور ان میں ملکیت کا تصور شروع ہوا، معاشرے میں قدروں کی بنیاد پڑنے لگی تو مرد اور عورت کے ساتھ رہنے کے عمل کو قانونی حیثیت دینے کی ضرورت پیش آئی۔ ابتداً مرد اور عورت بغیر کسی بندھن کے ایک ساتھ رہنا شروع کئے۔ بعد میں پھر بندھن کی شکل پیدا ہوئی اس کے بعد اس میں بھی تبدیلی آئی اور بندھن کی یہ صورت باقاعدہ معاہدے کے طور پر دونوں کے درمیان قائم ہوئی جس کو شادی کے بندھن سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ خاندان کو امتیاز عطا کرنے اور اس کی بنیاد رکھنے میں شادی ہی دراصل وجہ اول ہے۔ مرکزی خاندان کی شروعات اسی ایک بنیادی معاہدے سے ہوتی ہے جو شوہر اور بیوی کے درمیان اس کی مرضی اور معاشرے کی رضامندی سے لوگوں کے سامنے عمل میں لائی جاتی ہے۔ خاندان کی مرکزی یا بنیادی تشکیل کے بعد معاشرے میں تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ معاشی اسباب اور مرد وزن کے آبادی کے تناسب کے پیش نظر اس میں وسعت پیدا ہوئی۔ ابتداء میں کثیر زوجیت اور کثیر شوہریت کا رواج بہت سے علاقوں میں عام ہوا۔ انسانی تہذیب کے اس ابتدائی زمانے میں سلسلۂ نسب عورت سے ہی چلتا تھا اور جائداد کی مالک بھی عورت ہی ہوتی تھی ایسے خاندان کو ''مادرسری خاندان'' کا نام دیا گیا۔

مادرسری خاندان آج بھی دنیا میں ایسے قبائل موجود ہیں جہاں مادرسری خاندان ملتے ہیں اس میں ماں یعنی عورت کو خاندانی امور میں مکمل اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ جائداد کا سلسلہ صرف عورتوں میں چلتا ہے اس طرح شادی کے بعد شوہر بیوی کے گھر جا کر رہتا ہے۔ ہندستان میں میگھالے کے ''خاصی'' اور ''جنتیا'' قبائل میں مادرنسبی سلسلے کا رواج کچھ بدلاؤ کے ساتھ اب بھی قائم ہے۔ ان میں وراثت کی جائیداد عورتوں میں منتقل ہوتی ہے اگر چہ ان کی اقتداری حیثیت نہیں ہوتی اور عوامی معاملات میں وہ فیصلہ ساز نہیں ہوتیں۔

پدرسری خاندان:۔ جس میں سلسلۂ نسب اور سلسلہ جائداد مرد سے چلتا ہے کم وبیش اسے مکمل اختیارات حاصل

ہوتے ہیں وہی خاندان کا معاشی سیاسی اور اخلاقی سربراہ ہوتا ہے۔

''دنیا کا سماج بحیثیت مجموعی پدرسری اختیارات کے طریقے پر رائج رہا ہے اور آج بھی پورے وثوق کے ساتھ بڑی حد تک انسانی سماج کو مرد اختیاری سماج کہا جاتا ہے''۔(۱)

زمانہ قدیم سے اب تک دنیا میں جتنے بھی معاشرے کی شناخت اور ان پر تحقیقات ہوئی ہیں ان میں خاندان کسی نہ کسی شکل میں ضرور پایا گیا ہے۔ معاشرتی قدروں میں جوں جوں تبدیلیاں رونما ہوئیں خاندان کی ہیئت وساخت بھی بدلتی رہی۔ اختیارات واقتدار، حقوق وفرائض اور شادی وراثت کے قوانین میں بھی نئے نئے تصورات داخل ہوتے رہے۔

''پدرسری اور مادرسری خاندان کی یہ خصوصیات (جو مذکور ہوئیں) قبل صنعتی سماج میں زیادہ رائج رہی ہیں موجود صنعتی سماج میں جو کہ جمہوری اقدار کا حامل ہے اس میں مرد اور عورت دونوں کو حق جائداد تقریباً دنیا کے تمام ممالک میں مل چکا ہے۔ اور اس اعتبار سے پدرسری اور مادرسری خاندانوں کی پرانی پابندیاں اس حد تک باقی نہیں رہی ہیں''۔(۲)

خاندان کی یہ مادر نسبی یا پدر نسبی قسمیں اقتدار واختیار کی بنیاد پر ہیں اور یہ خاندان کی اندرونی شکل ہے۔ خاندان کی ہیئت وساخت یعنی اس کی ظاہری شکل کی بھی عام طور پر دو قسم کی جاتی ہے۔ مختلف سماجوں میں خاندان کی یہ شکلیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ ۱- مشترکہ خاندان، ۲- مرکزی یا نیوکلیر خاندان۔ مشترکہ خاندانی نظام میں دو چیزیں اہم ہوتی ہیں جو ہندستان کی خانگی زندگی کو دیگر ممالک کی خانگی زندگی سے ممتاز کرتی ہیں۔ اول یہ کہ وہ کیا ہے جو مشترکہ خاندان کو منظم رکھتی ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ ان کی طرز ہائش مشترک ہوتا ہے، جائیداد کی ملکیت مشترک ہوتی ہے، ان میں آپسی تعاون اور اشتراک کا جذبہ ہوتا ہے اور مذہبی اور سماجی رسم ورواج بھی یکساں ہوتے ہیں۔ دوم یہ کہ وہ کون ہیں جو خاندان کو مربوط رکھتے ہیں۔ وہ یہ کہ خاندان کے تمام افراد ایک ہی رشتے اور قرابتداری سے منسلک ہوتے ہیں، کئی نسلوں کی ایک مضبوط وحدت ہوتی ہے اور ان کے جائیداد بھی مشترک ہوتے ہیں۔ یہ جزوی اضافہ دراصل ہندستان کی نیوکلیر فیملی کو امتیاز عطا کرتا ہے کیونکہ ہندستان کی نیوکلیر فیملی ایسی ہے کہ یہ مشترکہ خاندان کا حقیقی جز معلوم ہوتا ہے اور جس میں اب بھی اشتراک کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ مشترکہ خاندان مختلف شکلوں میں ہوسکتی ہے لیکن اس میں ایک سے زیادہ جوڑے اور اکثر دو یا زیادہ نسلیں ایک ساتھ رہتی ہیں۔ اس میں انفرادی خاندانوں کے ساتھ بھائی یا بچوں اور

پوتے پوتیوں ان کے متعلقہ خاندانوں کے ساتھ بزرگ جوڑے ہو سکتے ہیں۔مشترکہ خاندان کو زیادہ تر ہندستان کی علامتی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔نیوکلیر خاندان صرف ماں باپ اوران کے بچوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

خاندان کی تاریخ کے تجزیہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مرکزی خاندان معاشرے اور سماج کی بنیادی اکائی میں عالمی حیثیت رکھتا ہے۔خاندان کی اس کے بعد جو پیچیدہ شکلیں وجود میں آئیں اس کی اساس مرکزی خاندان ہی ہے اور صنعتی دور میں یہ پرانی شکل ایک تغیر کے طویل سلسلے کے بعد بالکل نئے روپ میں پھر وجود میں آرہی ہے۔مرکزی خاندان معاشرہ در معاشرہ اور تہذیب در تہذیب سے گذر کر مختلف شکلیں اختیار کرتی رہیں۔خاص کر وراثت یعنی جائداد کی اگلی نسل تک منتقلی کی وجہ سے مشترکہ خاندان اور متحدہ خاندان کی شکل میں روایت پزیر ہوا۔ ہندوستان میں مشترکہ خاندان کی روایت کا چلن طویل زمانے سے قائم ہے لیکن اگر ابتدائی زمانے کے خاندان کی ہیئت پر غور کیا جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خاندان ایک دائرے کے گرد گھوم رہا ہے۔موجودہ دور کے ہر معاشرے میں اس کی وہی پرانی صورت نئی نئی پیچیدگیوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آرہی ہے۔مغرب میں تو اس کا چلن عام ہوا ہی ہے مشرقی ممالک بھی مشترکہ خاندان کی روایت کو کھوتے جارہے ہیں۔

جدید ہندوستان سے پہلے کا خاندان روایتی اقدار سے وابستہ تھا اور بیشتر معاشرے مشترکہ خاندان کے نظام کے تحت زندگی کے نشیب وفراز سے گذر رہے تھے۔ان میں اگر چہ اچھائیاں اور برائیاں دونوں تھیں مگر ہندوستانی سماجی زندگی کی سب سے نمایاں خصوصیتوں میں مشترکہ خاندانی نظام ایک اہم خصوصیت تصور کی جاتی تھی۔

> ''بے غرضی کی تعلیم جماعت کی برتری کا احساس، زندگی اور گزارے بیتے وسیلہ، معذوروں، بیماروں، بوڑھوں، بے روزگاروں، بچوں کی دیکھ بھال، تعلیم وتربیت یا دوادارو، بیواؤں کا خیال، یتیموں کی پرورش، قربانی کا خیال، اطاعت واحترام پسندی وہ خصوصتیں ہیں جو مشترک خاندانی زندگی کی بھلائیاں تصور کی جاتی ہیں۔معذور خانے اور اپاہج گھر، یتیم جانے اور بیوہ خانے، بوڑھوں اور صنعتوں کے لئے مکان، بچوں کی پیشہ ورانہ تعلیم گاہ، بے روزگاری، ناگہانی آفت، بیکاری کا بیمہ، دولت کی پیدائش میں شرکت اور دولت کے صرف میں حد بندی کا زیادہ معقول انتظام مشترک خاندانی طریق میں شامل بتائی جاتی ہیں''(۳)

ڈاکٹر جعفر حسن نے خاندان کی ان خصوصیات کو بیان کر کے جہاں ان کی ذمہ داریوں کا احاطہ کیا ہے اور مشترک خاندانی طریق کو اشتراکیت کا حقیقی نمونہ بتایا ہے وہیں مندرجہ ذیل اقتباس کے ذریعہ ان کی خامیوں کی طرف بھی نشاندہی کی ہے۔

''(مشترک خاندانی زندگی) اس طریق کی وجہ سے پیدا ہونے والی یا نشو نما پانے والی خرابیوں میں لا پرواہی، بے ذمہ داری، کاہلی، احسان فراموشیوں اور نکتہ چینیوں کی وجہ سے نمودار ہونے والی کڑواہٹ اور بے تکلفی، پٹی پن، بے دلی، بد دلی، وہ خصوصیتیں ہیں جو مشترک خاندانی زندگی کی تمام اچھائیوں کو بھلوا دینے کے لئے کافی ہیں۔

بے بسی مجبوری اور لاچاری بسا اوقات انسانوں کو عمل پر آمادہ کرتی ہے، انتہائی مصیبتیں ترقی اور خوشحالی کا ذریعہ اور سرچشمہ بنتی ہیں۔ جب خاندان کے افراد کو معلوم ہوتا ہے کہ گذر بسر کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ تو بہرحال ہے ہی تو ہو معاش پیدا کرنے کے لئے غیر معمولی کوشش نہیں کرتے اور چھوٹی قناعت کی وجہ سے بے روزگار رہتے ہیں۔ چند دنوں وہ اس کے عادی اور کاہلی میں مبتلا ہو کر طفیلیانہ زندگی بسر کرنے پر بھی کماؤ پوتوں کی طرح رہتے بستے ہیں۔

ہزاروں نہیں لاکھوں افراد اسی وجہ سے نکمے ہو گئے اور وہی لوگ جو یورپ اور امریکہ میں ہوتے تو ہاتھ پیر مار کر بہرحال سماج کے کارآمد رکن بنتے، ہندوستان میں فالتو اور طفیلی بنے بیٹھے ہیں۔ محض اسلئے کہ محنت کرنے والا لازمی سبب، کھٹ پٹی فن کی اصل وجہ موجود نہیں۔ جس کی بدولت انسان کی چھپی صلاحیتیں اجاگر نہیں ہوتیں اور وہی لوگ جو مجبوریوں کے تحت محنتی اور شاید قابل بنتے، تھوڑے بہت گذارے کے یقینی ذریعوں کے کارن نکمے اور جاہل رہ گئے ہیں۔

ساتھ ہی خاندانی افراد میں باہمی غلط فہمیاں اور مختلف خیالات

عورتوں کے باہمی ٹنٹے، مذاق اور طبیعتوں میں اختلاف، رشک، حسد، کینہ،
کپٹ، بغض، شماتت، اور مداخلت کی لت ایسی خاصیتیں ہیں جو مشترک
خاندانی طریق زندگی میں بہت آسانی سے نشونما پاتی ہیں۔'' (۴)

مذکورہ بالا دونوں اقتباس کے ذریعہ ہندوستان کے مشترک خاندان کی ہیئت وساخت، اس کی ذمہ داریوں اور انسانی وسماجی تقاضوں کی تشکیل میں اس کی اہمیت وافادیت کے ساتھ ساتھ اس کے کمزوریوں اور خامیوں کو بخوبی اجاگر کیا گیا ہے۔ خاندان کا تعارف اور انفرادی وسماجی زندگی میں اس کے منفی اور مثبت رویوں کے نشاندہی کے بعد اب ہم انگریزی سامراجیت کے پس منظر میں جدید ہندوستان اور اس کے سماج کی اہم اکائی کا بنیادی نظام، خانگی زندگی سے تعلق رکھنے والے واقعات کو بیان کریں گے تاکہ اس کے بعد مغربی تہذیب کے اثرات خاندان پر کس طرح مرتب ہوئے ان کی حقیقتوں کا جائزہ ادبی اور فنی تناظر میں لیا جاسکے۔

پندرہویں صدی کے آخری حصے میں برطانوی تاجروں نے مشرقی ممالک کے ساتھ تجارت کرنے کی غرض سے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی تھی جسے 1600 میں ملکۂ برطانوی ایلزبیتھ اوّل نے شاہی اسناد عطا کر کے اس کے اختیارات کی تعیین کی تھی۔ ہندوستان کے ساتھ تجارتی تعلقات کے سلسلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اختیارات میں کمی بیشی ہوتی رہی اور برطانوی حکومت مختلف اوقات میں نئے نئے قوانین کے ذریعے ان کے اختیارات میں اضافہ کرتی رہی جو 1857 تک جاری رہا۔ حالانکہ کمپنی نے اپنی تاجرانہ سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مقامی حکمرانوں اور راجاؤں کے داخلی معاملات میں 1857 سے پہلے ہی دخل اندازی شروع کردی تھی۔ اس کی واضح مثال 1757 میں پلاسی کی جنگ میں ان کی شرکت اور معاونت ہے۔ اس کے بعد بنگال کے صوبے کی سیاسی حالت انگریزوں کے تحت آنی شروع ہوئی کشمیر، سندھ اور اودھ بھی کمپنی کے اقتدار میں آگئے اس طرح ایسٹ انڈیا کو خانہ جنگیوں کی بدولت اپنی قوت بڑھانے کے مواقع ملتے گئے اور وہ ہندوستان کی سیاست میں داخل ہوتے گئے۔ ہندوستان کی تہذیب و معاشرت، ادب وثقافت اور سیاست وحکومت اس دور میں تنزل کی طرف گامزن تھیں مگر پھر بھی مشترکہ تہذیب کا دائرہ واثر قائم تھا اور قدیم روایتی طرز زندگی، فن تعمیر، فن مصوری، فن موسیقی اور خانگی زندگی کے مشترکہ رواج بدستور مقبول تھے اگرچہ مغلیہ سلطنت روبہ زوال تھی اور ملک اور سماج کی حالت دگرگوں تھی، فنون لطیفہ کے ہر شعبے سخت نقصان اٹھا رہے تھے اور معاشرے میں غذا، لباس، رسم ورواج وغیرہ کے اعتبار سے اختلاف اور تنوع کی صورتیں پیدا ہونے لگی تھیں لیکن ہندوستانی تہذیب ایک بنیادی وحدت سے ہم آہنگ تھی۔ 1757 کی جنگ پلاسی کے بعد سے 1857 تک

انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کا ہوس اور ظلم کا سلسلہ جاری رہا مگر ہندوستان پر انگریزوں کے تہذیبی اثرات کی جھلک نہیں دکھائی دیتی بلکہ اس کے برعکس کمپنی کی بے دردی، غارت گری اور غیر مذہبی و ظالمانہ حرکات سے عام ہندوستانیوں کو نفرت پیدا ہوگئی تھی۔ انگریزوں کی طرف سے ان کے دل مکمل طور پر بے زار ہو گئے تھے کیونکہ انگریز حکمراں ہندوستان پر قبضے کے بعد انتشار و بدامنی پھیلانے میں ہی مصروف رہے۔ تہذیبی اور سماجی زندگی کی طرف ان کی توجہ نہ رہی نیز اپنا کوئی اثر ہندوستان پر ڈالنے کی نہ ان میں اہلیت تھی اور نہ انہیں کوئی فکر تھی۔

1857 کی جنگ آزادی ہندوستان کی تاریخ میں کئی اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے۔ سیاسی طور پر اس انقلاب سے پوری طرح ہندوستان انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔ مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوا۔ ہندوستانی عوام خاص کر مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں زوال پذیری چھا گئی۔ 1857 کے بعد مختلف وجوہ سے برطانوی حکومت کے ساتھ مغربی تہذیب سارے ملک پر چھانے لگی اور ہندوستان کی ساری تہذیبی زندگی درہم برہم ہوگئی البتہ 1857 سے قبل وارن ہسٹنگیز کے عہد حکومت میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے تہذیبی تصادمات کی شروعات ہوگئی تھی یعنی 1773 میں جب برطانوی پارلیمنٹ نے کمپنی کی نگرانی اپنے ہاتھوں میں لی تو سول سروس کے تحت اچھے عہدیداران کمپنی سے وابستہ ہوئے جن سے مغربی تہذیب کے ذہنی اور مادی پہلوؤں کے اثرات ہندوستان پر پڑنے لگے۔ ہسٹنگیز ان میں سے ایک تھا جو روشن خیال تھا ہندوستان کی موجودہ تہذیب کے تحفظ اور ترقی میں اس نے دلچسپی لی تھی چنانچہ اسی کے فرمائش پر غلام حسین خان کے ذریعہ سیر المتاخرین لکھی گئی جو اٹھارویں صدی کی تاریخ پر مشتمل مستند کتاب ہے۔ اس کی سرپرستی میں مشرقی علوم کی ترقی کی خاطر کلکتہ میں 1754 میں رائل اشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی بنیاد پڑی، عربی و فارسی کی تعلیم کے لئے 1784 میں کلکتہ مدرسہ قائم ہوا، 1800 میں فورٹ ولیم کالج کا آغاز ہوا، بنارس سنسکرت کالج اور دیگر منصوبے تعلیم عامہ کے لئے بنائے گئے۔ اسی زمانہ میں انگریزی زبان کو بھی رفتہ رفتہ دفتری حیثیت حاصل ہونے لگی جس کے نتیجے میں ملازمت کی غرض سے لوگوں میں انگریزی تعلیم کی طرف رجحان بڑھے۔ راجہ رام موہن رائے نے سب سے پہلے انگریزی اور جدید علوم سائنس کی تعلیم کو ہندوستانیوں کی ذہنی ترقی کے لئے ضروری خیال کیا۔ چنانچہ ان کی کوششوں سے مغربی علوم کے لئے ادارے وجود میں آئے۔ غرض کہ اس عہد میں بعض انگریزوں اور ہندوستانیوں کی جدوجہد سے مشرقی اور مغربی علوم کے لئے سوسائٹی اور کالجیز قائم ہوئے لیکن چونکہ اکثر مذاہب کے لوگ حکومت کی اس تعلیمی اسکیم کے مخالف تھے اور سرکاری اداروں کے تئیں ان کا خیال یہ تھا کہ ان میں پڑھ کر لڑکوں کے مذہبی خیالات خراب ہو جائیں گے۔ اس طرح بعض عہد کے انگریز عہدہ داران بھی محض تاجرانہ ذہنیت سے مغلوب تھے اور تعلیمی

شعبوں سے غافل تھے اس طرح نامکمل اور غیر منظم صورت حال میں انگریزی تہذیب کا کوئی گہرا اور بنیادی اثر نہیں پڑا لیکن ہندوستان کی نئی نسل میں مغربی تہذیب سے واقفیت شروع ہو چکی تھی یہی نسل کچھ سالوں بعد ایک نئے اور متوسط حلقے کے طور پر ابھر کر سامنے آئی، اٹھارویں صدی کے آخر میں مغربیت کے تھوڑے بہت اثر قبول کرنے لگی، جدید مغربی تہذیب کی اصل روح دیکھنے اور سمجھنے کے مواقع انہیں میسر ہوئے خاص کر عیسائی مبلغین کے ذریعہ مذہب اور تہذیب کی نشانیاں ہندوستان میں در آنے لگی تھیں۔

''انگریزی اقتدار کے ساتھ ساتھ انگریزی تہذیب کے تھوڑے بہت اثرات بھی سخت مخالفت کے باوجود آہستہ آہستہ ملک میں نفوذ کر رہے تھے۔ انگریز اپنی تہذیب کو ہندوستان پر مسلط کرنا نہیں چاہتے تھے اس کے برعکس وہ خود ایک حد تک ہندوستانی تہذیب و معاشرت کو اختیار کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وارن ہسٹنگیز کی تہذیبی اور تعلیمی پالیسی نے اس میں عملی و علمی روح پھونک کر اسے نئی زندگی بخشنا چاہتے ہیں لیکن بیسویں صدی کے چوتھے عشرے سے انگریز حکومت کی پالیسی میں زبردست تبدیلی ہوئی۔ انگریزی زبان پہلے ذریعۂ تعلیم اور پھر سرکاری زبان بنا دی گئی۔ مشرقی تعلیم پائے ہوئے لوگوں پر روزی اور عزت کے دروازے بند ہونے لگے جیسے جیسے انگریزی حکومت کا دائرہ پھیلتا گیا اور یہ پالیسی نئے نئے علاقوں میں نافذ ہوگئی۔ ان لوگوں کی تعداد بڑھتی گئی جو اپنی ملکی تہذیب اور تعلیم کی کساد بازاری اور اپنی کس مپرسی کی وجہ سے انگریزی حکومت سے بیزار تھے اس پر طرہ یہ ہوا کہ ڈیلہوزی نے جو 1848 سے 1856 تک ہندوستان کا گورنر جنرل تھا، ایک دم سے بہت سی ہندوستانی ریاستوں کو ختم کر دیا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ اب قدیم تعلیم پائے ہوئے لوگوں کے لئے جائے پناہ نہیں رہے گی۔ ادھر تاجروں، ساہوکاروں اور کاریگروں کا طبقہ دکاندار حکمرانوں کے ہاتھوں اپنی تباہی دیکھ کر پہلے ہی نالاں تھے۔ سیاسی بے چینی اور تہذیبی تعصب کی ایک عام لہر پھیل گئی جس نے مذہب کی

آڑے لے کر عوام کو برانگیختہ کر دیا۔''(۵)

1857 کے ہنگامے کے بعد ہندوستان کی تہذیبی اور اقتصادی ابتری سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں نے جس طرح ہندوستانیوں خاص کر مسلمانوں کی قتل و غارت گری کو روا رکھا اور انہیں غربت و افلاس کے قعر عمیق میں ڈھکیل دیا۔ اور ساتھ ساتھ اپنی تہذیبی پالیسی اور نئی تعلیمی تحریک پر بھی زور دیا جس کے نتیجے میں ہندوستان میں متوسط طبقے کا وجود ہوا جو ہر طرح سے انگریزی وضع قطع اور علوم و فنون سے مرعوب ہو کر برطانوی سرزمین کی طرف مائل ہوئے۔ انگریزوں نے بحری سفر کو ترقی دیکر تہذیبی اور علمی تبادلہ کی صورت پیدا کی جس کی وجہ سے ہندوستان میں اصلاحی اور سیاسی بیداری آ گئی۔ اس دور میں ہندوستانی سماج و معاشرت کی ترقی کے لئے مختلف تحریکیں وجود میں آئیں۔ سرسید تحریک اس دور میں فعال اور سرگرم تحریک تھی۔ اس کے پس منظر کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اس کا مقصد مسلمانوں کے اندر سیاست ،تعلیم، مذہب، معاشرہ، تہذیب وثقافت اور اخلاقی اقدرا کی روح پھونکنا تھا۔ 1857 کے اس المیہ کے بعد سماجی زندگی کا کوئی پہلو بھی ایسا نہ تھا جس میں تبدیلیاں رونما نہ ہوئی ہوں، ثقافتی نقطۂ نظر سے یہ ایک بڑا قومی سانحہ تھا اقتصادی، بدحالی نے پیشہ وروں اور صناعوں کے معاشی حالات پر کاری ضرب لگائی خاندانوں کی کایہ پلٹ دی۔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور مشترک خاندانی زندگی کو ایک اذیت ناک بکھراؤ کے مرحلہ سے گذرنا پڑا۔ خاص کر فتح مند انگریزوں نے اس جنگ آزادی کو غدر کا نام دیکر اس کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دی۔ اس سے مسلمانوں میں بھی انگریزوں کے تئیں غم و غصہ اور نفرت پھیلی۔ سرسید نے زمانے اور حالات کی باریکیوں کو اجاگر کرتے ہوئے انگریز اور مسلمانوں کی مزاحمت کے لئے ایک نئے طریقے سے مفاہمت کی صورت اختیار کی اور انگریزوں کی مخالفت کے بجائے مسلمانوں کی اصلاح کی طرف پوری توجہ دی۔ اس تحریک کی کوششوں کے نتیجے میں خانگی اور معاشرتی زندگی کے ساتھ ساتھ معاشی حالات میں بھی بڑی تبدیلیاں آئیں۔ غرض کہ اس تحریک نے مشرق و مغرب کی مفاہمت کو اساس بنا کر مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم کے لئے ایسے عناصر کو قبول کرنے کی روایت قائم کی جس سے معاشرے میں نئی نئی قدریں پروان چڑھنے لگی اور لوگوں میں مغربیت کے رجحانات بڑھنے لگے۔ مغربی حکام کی طرز زندگی کی تقلید شروع ہوئی اٹھارہ سو پچاسی 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس ایک سیاسی جماعت بن کر ابھری اور ملکی سیاست میں متوسط طبقے کی مداخلت پر حصہ داری کے لئے منظّم طریقے سے کار بند رہی۔ ہندوستان کی سماجی اور خانگی زندگی میں بدلاؤ کے واضح نمونے یہاں سے شروع ہوتے ہیں۔ تعلیم یافتہ طبقہ میں قدیم روایات وتوہمات سے بیزاری اور انگریزی طرز زندگی سے دلچسپی بڑھنے لگی خاندان کی وہ

صورت جس میں کئی نسلیں زندگی بسر کرتی تھیں اس میں بکھراؤ اور علیحدگی کی کیفیت نمودار ہونے لگی چنانچہ سیاست داں یا تعلیم یافتہ افراد جو ملازمت اور سیاست سے وابستہ ہو رہے تھے وہ ایک جداگانہ نوعیت کی خانگی زندگی بھی اختیار کر رہے تھے اس کے نمونے سجاد حیدر یلدرم، مجنوں گورکھپوری، راشد الخیری، علی عباس حسینی اور پریم چند وغیرہ کے افسانوں میں جا بجا ملتے ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز تک ہندوستانی سماج میں رسم و رواج، عادتوں، خصلتوں، رشتے اور قرابت داری کے بندھنوں، گاؤں اور شہروں، اعتقاد و اعتماد، مشاغل اور مصروفیات میں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اور نئے نئے کلچر، رہن سہن کے طریقے، خورد و نوش کی اشیاء میں اضافے جاری تھے جس کی وجہ سے خانگی، جنسی اور گھریلو زندگی میں بھی انقلابی تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ مثال کے طور پر صنعتی ترقی کے زیر اثر شہروں کا نظارہ پھیل رہا تھا، گاؤں کی سرحدیں سمٹتی جا رہی تھیں، شہر اور گاؤں کے امتزاج سے ایک نئی ثقافت وجود میں آ رہی تھی، شریف گھرانے کی مستورات، پردہ جن کا شیوہ تھا شرم و حیاء جن کا زیور تھا، شوہروں کی خدمت جن کا دھرم تھا اور بچوں کی پرورش کرنا جن کا ایمان اور جن کے دلوں دماغ میں جنسیت کے تئیں معصومانہ کیفیت تھیں، میں بھی تعلیمی شعور بیدار ہو رہے تھے اور ازدواجی و خوانگی زندگی پر نئے نئے اثرات مرتب ہو رہے تھے اور اس قسم کی اور بھی خصوصیتیں جو ہندوستان کی خانگی زندگی کے اہم نمونے تھے ان میں مختلف زاویہ نظر سے ہر جہتی اصلاح کی کوششیں ہو رہی تھیں پھر بھی تغیراتی حرکت و رفتار کے سلسلے جاری تھے۔ ہندوستان کے اس دور کی سماجی زندگی کا تجزیہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک کہ برطانوی حکومت و تہذیب اور ہندوستانی تحریکات و روایات کے مابین عمل اور ردعمل پر غور نہ کیا جائے۔ بیسویں صدی کی ابتدا سے ہی ہندوستان میں فعال تحریکیں سرگرم ہو گئی تھیں۔ سبھی تحریکوں کا واسطہ سماجی مسئلوں سے تھا کیوں کہ ہندستان میں موجود ہر معاشرے کے درمیان تہذیب و ثقافت کے معاملہ میں اتفاقی صورت کے ساتھ ساتھ نزاعی کیفیت بھی کارفرما تھی۔ اس کے علاوہ حکومت کے جبر سے آزادی اور مغربی سیاسی طرز سے بیزاری دونوں طرح کے جذبات ہر دل میں پروان چڑھ رہے تھے لہٰذا اپنے سماج کی برائیوں کی اصلاح اور غیر ملکی قانون و سیاست سے چھٹکارا پانے کے لئے مذہبی اور معاشرتی یک جہتی کو بروئے کار لاتے ہوئے اجتماعی قوت کو قوی تر بنانے کی ضرورت ناگریز ہو گئی تھی۔ اس صورت حال میں منظم طریقے سے مسائل کا حل بغیر تحریکات کا سہارا لئے ممکن نہیں تھا چنانچہ اس صدی میں عورتوں میں بیداری ذات پات کے خاتمے کی تحریک، سودیسی تحریک، شیوراج تحریک، ستیہ گرہ کی تحریک، مسلم لیگ، تحریکِ عدم تعاون، کمیونسٹ تحریک اور ان کے علاوہ اور بھی تعلیمی، تہذیبی پسماندگی سے ابھرنے کے لئے مختلف تنظیمیں اس عہد کی تاریخ کے اہم نمونے ہیں جن کے

اثرات ہندوستانی سماج کے ہر شعبے میں بتدریج مرتب ہوئے ہیں۔

بنیادی سطح پر سماج اور خاندان کا انحصار معاشی ترقی پر ہے یعنی وہ تبدیلیاں جو کسی سماج کی صورت حال کی بنیاد کو ایک مدت کے دوران بدل ڈالے، اس کی ہیئت میں نمایاں فرق پیدا کردے ان میں معاشیات کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ برطانیہ کے صنعتی انقلاب کے اثرات پوری دنیا میں محسوس کئے گئے تھے۔ ہندوستان میں صنعتی کارخانے کے وجود سے معاشی حالات میں بڑا انقلاب آیا عوامی شعبہ میں خصوصا اور قومی سیاست میں عموماً صنعتی ترقی کا اہم رول رہا ہے۔ جاگیردارانہ نظام کا زوال، زمین سے متعلق نئے قوانین، زراعتی مزدوروں کی صنعتی کارخانوں سے وابستگی اور گھریلو صنعتوں میں تبدیلیوں کی صورت صنعتی ترقی کے نتیجے میں پیدا ہوئی اس طرح ہندوستان میں معاشی کایا پلٹ نوآبادیات کے ساتھ ہی شروع ہوئی۔ ہندوستان جو کہ دیہی برادری والا ملک ہے اپنی گھریلو صنعتوں کے ذریعہ خود کفیل اور ان کا معاشی نظام ابتدائی طور پر غیر بازاری لین دین کی بنیاد پر منظم تھا۔ نوآبادیات کے دوران کاروباری روپے پیسے کو معاشی نظام کے مقامی کسان معاشی نظام میں آنے اور لین دین کے وسیع حلقوں میں ان کے مسائل دیہی اور شہری سماجوں میں زبردست سماجی اور معاشی تبدیلی ہوئی۔ نوآبادیاتی دور کے معاشی ردوبدل جیسے انگریزوں کا یہ مطالبہ کہ زمین کے لگان کو نقد ادا کرنا ہے یہ واضح کرتا ہے کہ ہندوستان میں معاشی نظام کار کی حیثیت سے نقدی لین دین شروع ہو رہے تھے، تجارت میں روپے، پیسوں کا استعمال ہونے لگا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی ہندستان میں جامع اور ترقی یافتہ تجارتی نیٹ ورک موجود تھا۔ ہندستان میں کرگھے کے کپڑوں کی اہم صنعت موجود تھی اور برآمدی سوتی اور منہگے ریشموں کے تجارت کا نظام بھی تھا۔ ساتھ ساتھ مختلف قسموں کے مسالہ جن کے عالمی بازار میں خاص کر یورپ میں بہت مانگ تھی تجارت کا اہم ذریعہ تھا۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ نوآبادیاتی دور سے پہلے ہندوستان میں ترقی یافتہ پیداوار کے مراکز کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے تاجروں کا منظم سماج تجارتی نظام اور بیکنگ نظام بھی موجود تھا۔ ذات، رشتہ داری اور خاندان کی بناوٹ سب تجارت کے موافق تھیں۔ اور تجارت انہیں سماجی ڈھانچوں کے تحت ہوتی تھی۔ برطانوی حکومت کی صنعتی ترقی کی ابتداء کے ساتھ معاشی نظام میں گہری تبدیلیاں ہوئیں جس کی وجہ سے پیداوار، زراعت اور تجارت میں انقلابی انتشار آیا جس کی ایک اہم مثال ہینڈلوم کے کام کا خاتمہ ہو جانا ہے، اس طرح انگریزی حکومت سے پہلے ہندوستان بنے بنائے سامانوں کی برآمدات کا مرکز تھا۔ نوآبادیات کے بعد کچے مال اور زرعی سامانوں پر انگریزوں کے قبضے کے بعد تیار سامانوں کا خریدار بن گیا۔ ظاہری بات ہے کہ یہ دونوں کام برطانوی کارخانوں کو فائدہ پہونچانے کے لئے کئے گئے تھے اس کے بعد ہندوستان میں تجارتی سماج کے اندر نئے نئے گروہ آنے لگے۔ ہر معاشرے اور ہر

سماج کہ جس میں تجارتی کاروبار کی اہلیت تھی وہ نئے تجارتی نظام سے ہم آہنگ ہونے لگے، وہ تجارتی برادری جو پہلے سے ہی موجود تھے انہوں نے بدلتے ہوئے معاشی ماحول کے مطابق خود کو ڈھالا اور اپنی حیثیت کو سدھار کر برطانوی حکومت کے ذریعہ مہیا کرائے گئے معاشی مواقع کا فائدہ اٹھانے لگے۔ اس کے علاوہ نئی نئی تجارتی برادریوں کا وجود اسی دور میں ہونے لگا جس کی مثال ہندوستان کے اکثر حصے میں پائے جانے والی مارواڑی برادری ہے۔ ان برادریوں نے گھریلو صنعتوں کے ساتھ ساتھ دکانداری اور تجارتی پیشے کو اختیار کیا اور اس طرح کثیر آبادی والے شہروں جیسے کلکتہ میں انہوں نے ملنے والے مواقع کا فائدہ اٹھایا۔ تجارت اور ساہوکاری جاری رکھنے کے لئے ملک کے تمام حصوں میں آباد ہو گئے۔ بہت سارے مرواڑی خاندان نے سرمایہ داری میں ایسی کامیابی حاصل کی کہ لوگوں کو سود پر قرض دینے لگے اور اس منافع کی بدولت اپنے آپ کو جدید صنعتوں میں تبدیل کر لئے۔ انگریزی حکومت کے دوران ان تجارتی وسعت کو دیکھ کر نئے نئے تجارتی برادریوں کا ابھر کر آنا اور ان کا چھوٹے تاجر اور کسان مزدور سے بڑے ساہوکار مہاجن اور صنعت کاروں میں بدل جانے کی بہت ساری ایسی کہانیاں ہیں جن سے معاشیات کی ترقی وابستہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ سماج معاشرہ تہذیب، روایت، خاندان اور یہاں تک کہ افراد میں پیدا ہونے والے تغیرات کی کڑیاں اسی سے منضبط ہیں۔ جیسا کہ کارل مارکس کا نظریہ ہے، معاشی نظام سماجی نظام ہیں ہر ایک پیداوار کا طریقہ خاص پیداواری رشتوں سے بنتا ہے اور آخر کار ایک خاص طبقہ کے دھانچہ کو تیار کرتے ہیں۔ معاشی نظام اشیا سے نہیں بلکہ لوگوں کے بیچ رشتوں سے بنتا ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ معاشی ادارہ خود بھی ایک سماجی ادارہ ہے اور ان تمام سماجی اداروں (خاندان، ذات، وغیرہ) سے جڑا ہوا ہے۔ اس دور کی صنعتی تیز رفتاری سے یہ واضح ہو جاتی ہے کہ اس دور میں سماجی تبدیلیوں کے نتائج کیا رہے ہوں گے۔

معاشی اور سماجی نوعیّتوں کے ساتھ ساتھ خاندان کے ڈھانچے میں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں مذہب کے تئیں اقتصاد اور ایمان کی شدت روز بروز گھٹتی رہی شادی کے رسم ورواج، رہن سہن اور غذا ولباس کے طریقے غیر ملکی طرز سے ہم آہنگ ہونے لگے جس سے بعض معاشرے میں خاندان کی مشترک صورت سمٹنے لگی اور خاندان کے ساتھ ساتھ رہائش کے طور طریقوں میں بھی فرق آتا گیا۔ انسان کو جس طرح کی ضرورت پیش آئی اس نے خاندان و رہائش میں تبدیلی اختیار کر لی خاص کر صنعتی دور میں خاندان کی شکل اور اقامت میں نمایاں تبدیلی یہ رونما ہوئی کہ گھر چھوٹے ہو گئے اور ان میں بڑے خاندان کی گنجائش مفقود ہوتی گئی۔ پھر معاشی حالت کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے نئی نسلوں میں

ہجرت اور نئے نئے ملازمت اور روزگار کو حاصل کرنے کے رجحانات در آتے گئے۔ گھر اور جائے ملازمت میں دوری اور دیگر مسائل ایسے پیدا ہوئے کہ لوگ اپنے پشتینی مقامات چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اور دوسری جگہ جا کر وہاں کی ثقافت و معاشرت میں اپنے آپ کو ڈھال دیا اور دوسری بات یہ کہ اس معاشرے میں مقابلہ کی ہوڑ نے اسے ایسا جکڑا کہ اس کی تمنائیں، آرزوئیں اور ضرورتیں وسیع تر ہوتی گئیں اور بالآخر ایسی صورت حال پیدا ہوئی کہ اپنے آبائی مقام کی طرف لوٹنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس طرح ہندوستان کا وہ معاشرہ جو بہت سے اعتبار سے روایتی معاشرہ تھا اس میں تیزی سے تبدیلیاں شروع ہونے لگیں۔ اس میں سب سے بنیادی تبدیلی خاندان کی ساخت اور اس کے فرائض کی تبدیلی ہے۔

اگر چہ خاندان سماجی اکائی کا ایک ایسا ڈھانچہ ہے جس میں زمانہ قدیم سے اب تک مسلسل تغیرات ہوتے رہے ہیں اس کے عوامل مختلف ادوار میں مختلف رہے ہیں جس طرح معاشرے بنتے اور بگڑتے رہے اسی طرح خاندان کی صورت حال بھی متغیر ہوتی رہی لیکن برطانوی حکومت کے آغاز سے 1947 تک کے درمیانی عہد میں تبدیلی کی رفتار تیز ہوئی اور بہت واضح بدلاؤ کی صورت ہر شعبے میں پیدا ہوئی اس کے باوجود پورے برصغیر جنوبی ایشاء کے معاشروں کا حال جداگانہ نوعیت کا تھا۔

> ''غالباً ایک کروڑ چھ لاکھ افراد نے دونوں طرف ہجرت کی اور دو لاکھ سے لے کر دس لاکھ تک قتل کئے گئے جائدادیں لوٹی گئیں، عصمتیں برباد کی گئیں، بچے قتل کئے گئے، بے شمار لوگ زندہ آگ میں جھونک دئے گئے، لاکھوں حرامی بچے جنے گئے، لاکھوں عورتیں بیوہ ہو گئیں، پیٹ کے بچے مار دئے گئے، ماں باپ بھائی بہن کی نظروں کے سامنے لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ زنا بالجبر کیا گیا، لاکھوں عورتیں رنڈی بنا دی گئیں، عورتوں، لڑکیوں، بوڑھیوں، بیٹیوں، ماؤں، بہنوں کی مادر زاد ننگی جماعت نکالی گئی۔ ان کے آگے پیچھے مردوں کی شور مچاتی اور ڈھول بجاتی ٹولی اور بیچ میں ان ننگی عورتوں کی بھیڑ، عورتوں کی اندام نہانی میں نیزہ بھونکنے پر بہتے خون سے ان کی پیشانیوں پر، نوکھالی اور لاہور کا بدلہ'' لکھا گیا، یہ سب فرقہ واریت کی آڑ میں کیا گیا اور بے روک ٹوک کیا گیا۔''(۶)

فرقہ وارانہ فسادوں کا سلسلہ آج بھی جاری ہے تقسیم کے بعد سے اب تک اندازاً پانچ ہزار فرقہ وارانہ فسادات

اور تقریباً ایک لاکھ آدمی قتل ہو چکے ہیں۔ مولانا آزاد کو ماؤنٹ بیٹن نے یہ یقین دلایا کہ وہ فسادات کو ہونے نہیں دیں گے لیکن فسادات ہوئے اور بے شرعی اور بربریت کی تمام حدوں سے آگے بڑھ کر ہوئے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں:۔

''پوری دنیا جانتی ہے کہ ماونٹ بیٹن کے بہادرانہ بیان کا کیا ہوا جب تقسیم ہوگئی تو ملک میں خون کی ندی بہادی گئی، معصوم مرد عورت اور بچے قتل کئے گئے، ہندوستانی فوج بھی منقسم ہوگئی اور ہندو مسلمان کے قتل کو روکنے کے لئے کچھ بھی مناسب قدم نہیں اٹھاتے گئے۔

تقسیم پر کلکتہ، بمبئی، بہار، یوپی، دہلی، گڑگاؤں، اور پنجاب میں اتنے فسادات ہوئے کہ ان کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ دیول کے خیال میں بنگال میں تخمیناً پانچ ہزار افراد قتل کئے گئے سیروائی کی رائے میں پندرہ ہزار زخمی اور ایک لاکھ بے گھر ہو گئے۔

''ہندوستان کو تقسیم کی قیمت چھ لاکھ عوام کی قتل اور ایک کروڑ چالیس لاکھ افراد کی عظیم سے دینی پڑی۔''(۷)

ہندوستان سے لاکھوں افراد پاکستان گئے اور پاکستان سے لاکھوں افراد ہندوستان آئے۔ دہلی میں جب حالات بہت زیادہ فرقہ وارانہ ہو گئے تو مسلمانوں کو سردی کے موسم میں پرانے قلعے میں پناہ لینی پڑی۔ فوج بھی فرقہ پسند ہوگئی۔ راجندر پرساد یادو نے فوج کو ہندو مسلم یونٹ میں تقسیم کے لئے اکسایا۔ برصغیر کے ہر 35 فرد میں سے ایک کو ہجرت کے کرب سے گزرنا پڑا۔

تقسیم اور فرقہ واریت کے ایک بڑے محرک کا نام ماونٹ بیٹن بھی تھا۔ اس کے بعد پٹیل کا نام آتا ہے، ماونٹ بیٹن کی یہی تمنا تھی کہ دونوں نئے ممالک میں آخری عظیم انگریز گورنر جنرل کے نام سے ہمیشہ یاد کیا جائے بھلے ہی اس کے لئے لاکھوں کو قتل اور لاکھوں کو ہجرت کیوں نہ کرنی پڑے۔

ہندوستان میں برطانوی حکومت کے درمیان ہی نئی سیاسی پالیسیاں بلند ہو چکی تھیں اور تہذیبی تاریخ کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور کافی بیدار چکا تھا، 1947 کے بعد سیاست کی باگ ڈور اور پورے ملک پر ہمارا اقتدار قائم ہو اتو دفعتاً ملک، سماج، جماعت اور فرد کا نقشہ ہی بدل گیا۔ دستور کی تدوین میں ہندوستان کو ترقی یافتہ ممالک کے آئین کے عمدہ قوانین سے مدد ملی اور اس طرح ہندوستان قومی ترقی کی خاطر مختلف النوع منصوبے کو عمل میں لایا۔ ملکی

ساخت کو مدنظر رکھتے ہوئے سماجی اور معاشرتی نظام کے ہر جہت کا احاطہ کرتے ہوئے اور زندگی کے مختلف زاویے کا خیال کرتے ہوئے دستور ہند کا خاکہ تیار کیا گیا۔ اس دور سے تہذیبی، سماجی اور خانگی زندگی کی تاریخ میں مختلف بدلاؤ اور ترقی کے متعدد راستوں کے باب کھلے۔

برطانوی سلطنت میں سیاست کا غلبہ ہونے کے باوجود مغربی تہذیب کے اثرات کی مقدار بہت کم تھی۔ جیسا کہ جعفر حسن لکھتے ہیں:۔

''ہمارے ملک کی آبادی کا صرف سواں حصہ پچھمی کلچر سے متاثر ہوا ہے اس سوویں کا سواں پچھمی کلر میں گھل مل گیا ہے اور اسی حد تک ہمارے کلچر اور سماج میں نیا پن نظر آتا ہے ورنہ عام طور پر ہندوستان قدامت کے چنگل میں پھنسا ہوا ہے جس کے ثبوت ہمیں خود شہروں کی اکثریت میں وہ بھی ظاہراً پچھمیائے ہوئے گھرانوں میں ملتے ہیں۔۔۔۔کوئی قانون ساز مجلس کا رکن ہے، کوئی بڑے انتظامی عہدے پر فائز ہے، کوئی کسی اہم تفتیشی کمیشن کا صدر ہے، کوئی کسی بڑی انجمن کا کرتا دھرتا ہے، مگر سب کے سب فرقہ واریت ہی نہیں، جز فرقہ واریت میں، قومیت میں نہیں، صوبہ واریت پردیشیت میں مبتلا ہیں سب کے سب کنبہ نوازی اور دوست پروری کرنا اور اپنوں کو بھرنا چاہتے ہیں۔ سب کے سب حقوق کے طلب گار اور فرائض سے انجان ہیں۔ سب کے سب یا ان کی عظیم اکثریت، اس طرح مستفید ہوتا چاہتی ہے جس سے بظاہر ان کا فائدہ گر حقیقت میں خود ان کا نقصان ہے۔ جاہلانہ تنگ نظری اور مجرمانہ جہالت ان کی سیرت و کردار کی نمایاں خصوصیتیں ہیں۔ انہوں نے یورپ سے یہ تو سیکھا ہے کہ اونچے جیون معیار پر زندگی بتانی چاہئے۔ آرام اور ٹھاٹھ سے زندگی گزارنی چاہئے۔ سادھوں کا تپس اور بدھ مستوں کی سی نفس کشی، نئے زمانے کو بہانے دینے والے اصول نہیں ہیں۔ انہوں نے یورپ سے علمی ادارے، کاروباری طریقے، راج کاجی اصل حاصل کئے ہیں۔ مگر وقت کی پابندی، ڈسپلن کی اہمیت، فرض شناسی،

TH-20081
Jawaharlal Nehru University Library

اصول دوستی، تحقیق پسندی، نیچر پرستی، قدرت کا مطالعہ، سیر وسیاحت کا شوق،
کاروباری سلیقہ، پاکیزگی، صفائی، ارٹ پرستی، نفاست، سماج سیوا وغیرہ میں
سے کچھ نہیں یا بہت کم یا برائے نام سیکھا ہے۔''(۸)

مذکورہ بالا اقتباس کا الحاق ہندوستان میں موجود ہر طرح کے معاشرہ پر صادق نہیں آتا کیوں کہ یہ بات جہاں درست ہے کہ ایک طبقہ مغرب زدگی کا شکار تھا تو بہت سارے طبقے ہندوستان میں ایسے بھی تھے جو مغربی تہذیب کی آزادانہ روش سے متنفر تھے۔ غرض کہ انگریزوں کا سیاسی اقتدار تقریباً ایک صدی تک ہندوستان پر قائم رہا مگر ان کا تہذیبی اقتدار ہنوز قائم نہیں ہوا تھا اور مغربی تہذیب کے مادی وسائل، ریل، تار اور دیگر تکنیکی وترسیلی ذرائع ملک کے بڑے حصے میں پھیل گئے تھے اور عموماً ہندوستانیوں کے دل میں حیرت وتعریف کے جذبات پیدا کر رہے تھے اور ظاہری طور پر ان کی ترقی یافتہ طرز زندگی سے رغبت پیدا ہو رہی تھی لیکن ان کے ذہنی عناصر کا اثر بہت خفیف تھا۔ اور وہ بھی معدود چند ام البلاد مقامات میں یا مغربی تعلیم یافتہ اور برطانوی صنعتی سرمایہ داری سے وابستہ حلقوں تک ہی محدود تھا۔ ملک کی اکثر آبادی میں مغربی تہذیب کے اثر انگیز نہ ہونے کی کئی وجہیں تھیں جن میں ایک اہم وجہ ہمارے خیال سے خاندانی نظم وضبط کا مضبوط ڈھانچہ تھا جس کا ہر فرد اتالیقی حیثیت کا حامل تھا دوسری وجہ بدیہی طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ ملک کی جغرافیائی صورت حال کا جکائزہ لیا جائے تو بہ اندازہ کرنا ہر شخص کے لئے ممکن ہوگا کہ ہندوستان کی آبادی کا بیشتر حصہ ایسے مقامات پر مشتمل ہیں جو ہر طرح کے تہذیبی، معاشرتی، ثقافتی، روایتی اور خانگی طریقہ کار کے لین دین سے مکمل طور پر محفوظ تھے۔ اکیسویں صدی میں بھی ہم اپنے اردگرد کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے آج بھی بے شمار علاقے کے ایسے نمونے ابھر کر سامنے آتے ہیں جن میں پرانی تہذیب کا رواج قائم ہے اور اس میں تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ان کو یہ احساس بھی نہیں ہے کہ ان کا سیاسی، تعلیمی اور معاشی زبوں حالی اور پس ماندگی دراصل ذہنی اور اخلاقی انحطاط کے نتیجے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہوا ہے کہ ان کی مذہبی اور معاشی زندگی میں ان کے کلچر اور طرز رہائش حقیقت کے روح کم اور تصنع کا رنگ زیادہ ہو گیا ہے اور مجموعی طور پر ان کی تہذیب اس قدر جامد ہو گئی ہے کہ ان کی ترقی کے امکانات پر تعطل اس طرح چھا گیا ہے کہ ان میں نشو نما پانے اور اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق کرنے کی طاقت نہیں رہی۔

جدید ہندوستان کی تاریخ کے آغاز سے اکیسویں صدی کی موجودہ دہائی تک کے طویل عرصے میں خاندان کی ہیئت وساخت اور ارتقاء کی کوئی واضح شکل کا نمونہ پیش کرنا نہایت دشوار گزار امر ہے اس لئے کہ اس پوری مدت میں ایسے ایسے واقعات رونما ہوئے جن سے سماجی معاشرتی اور خانگی زندگی کسی نہ کسی طور پر متاثر ہوئی مثال کہ طور پر انگریزوں کی آمد

ہی تبدیلیوں کا ایک بڑا محرک ثابت ہوسکتا ہے اس کے بعد ان کے ہوس اقتدار نے جس طرح تخریبی اور تعمیری کارنامے انجام دیئے اور اپنی ذہنی برتری سے لوگوں پر اثر انداز ہوئے اس کے بعد 1857 کی جنگ آزادی اور بالآخر 1947 میں آزادی اور فسادات کے ملے جلے کامیابی اور ناکامی اور اس درمیان میں بہت ساری سیاسی اور اصلاحی تحریکات جس سے کہ جدید ہندوستان کی پوری تاریخ پُر ہے، ان سے بہت سارے خاندان جہاں بکھراؤ کا شکار ہوئے وہیں بے شمار خاندان تنظیم نو سے ہم آہنگ بھی ہوئے۔ لیکن پھر بھی یہ تصور ہندوستان میں موجود ہر معاشرہ کو محیط نہیں ہے کیوں کہ اس کے باوجود مشترک خاندان، توسیعی خاندان اور نیوکلیر خاندان کی تینوں شکلیں ہمیشہ موجود رہی ہیں اور آج بھی اس کے بیشتر نمونے ملک کے ہر خطے میں معمولی بدلاؤ اور نئی نئی پیچیدگیوں اور مسائل کے ساتھ موجود ہیں۔ 1947 یعنی آزادی سے پہلے کے حالات جس طرح اس باب میں بیان کئے گئے ہیں اس سے خاندان کی ہیئت وساخت اور ارتقا کے تسلسل کی دھندلی تصویر ابھر کر سامنے آئی ہے لیکن آزادی کے بعد مشترکہ خاندان کا رواج ہونے کے باوجود اس کی تبدیلی میں حرکت پزیری تیز ہو جاتی ہے۔ ہندوستانی معاشرے میں خاندان کی نوعیت عام طور پر توسیعی اعتبار سے باقی ہے یعنی یہ خاندان ماں باپ بچوں کے علاوہ دادا دادی، چچا، پھوپھیاں، رشتے دار، قرابت دار اور برادری پر مشتمل تھا اور اس میں سب سے بزرگ شخصیت کی سربراہانہ حیثیت مسلم تھی۔ لیکن جیسے جیسے جدیدیت انفرادیت اور گاؤں سے شہروں کی طرف آمد ورفت، کارخانوں، صنعتی اداروں میں شمولیت، ذرائع ابلاغ کے ذریعہ دوسری دور دور کی ثقافتوں سے واقفیت اور حکومتی ترقیاتی پالیسیوں کا نفاذ و خاندانی منصوبہ بندی کے افادیت کے فارمولے جوں جوں بڑھتے گئے۔ انسانی ذہن ضرورتوں میں مبتلا ہوتا گیا جس سے کہ خاندانی نظام کمزور اور اجتماعیت میں بکھراؤ کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔

خانگی زندگی کی ہیئت وساخت کے ارتقا میں شہری زندگی کے عروج کا اہم رول ہے پورے ہندوستان میں شہری تہذیب کے اثرات کا فروغ مختلف خطے کے لوگوں کے میل جول کی بنیاد پر ہوا۔ شہروں کی طرف ہجرت کا رجحان سب سے پہلے اعلی ذاتوں اور متوسط طبقوں سے شروع ہوا اور اس کے بعد ان کی زندگی اور رہن سہن کی بہتری کو دیکھ کر دوسری ذاتوں اور طبقوں نے گاؤں کو چھوڑ کر شہروں کی طرف رخ کیا۔ لیکن سب سے پہلے اونچی ذاتوں اور متوسط طبقوں کو ہی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ مغربی تعلیم کے کیا فائدے ہیں اور اس فائدہ کی حصولیابی کے لئے کون سی جگہ مناسب ہے یہی وجہ ہے کہ سب سے پہلے انہیں طبقوں اور ذاتوں کی پہلی نسل، ٹیچر، سرکاری افسر، ڈاکٹر، وکیل اور جج بنی۔ سماجی زندگی میں انہیں نہایت اہم مقام حاصل ہو گیا۔ گاؤں میں وہ مذہبی لحاظ سے اور زمینوں کے مالک ہونے کے ناطے ایک وسیع مشترکہ خاندان کے نظم وضبط سے بھی وابستہ تھے اور مشترکہ خاندان کے تہذیبی و روایتی اقدار پر کاربند بھی تھے لیکن

شہروں میں جب انہیں سرکاری یا تجارتی عہدوں کی اجارہ داری حاصل ہوگئی تو گاؤں اور خاندان سے وابستگی کمزور ہوتی گئی۔ ابتداً بعض افراد نے اتنا کیا کہ اپنی موروثی زمینوں میں اضافے تو نہ کر پائے لیکن ان کو برقرار رکھا مگر رفتہ رفتہ شہری زندگی میں اس طرح گھل مل گئے اور اپنی معیاری زندگی کو اتنا بلند کرلیا کہ ضرورتیں وسیع سے وسیع تر ہوتی گئیں۔ جیسے اعلیٰ تعلیم کے اخراجات، شادی بیاہ کے جدید طریقے، گھریلو زندگی میں اخراجات کے شاندار طریقے انجام دینے کی وجہ سے لازماً انہیں اپنی زمینوں سے محروم ہونا پڑا اس طرح زمین جو گاؤں اور مشترکہ خاندان سے وابستگی کا اہم ذریعہ تھا وہ بھی منہدم ہوگیا خاص کر ہندو خاندان کے اعلیٰ ذات برہمنوں کی اہم عہدوں پر اجارہ داری کی وجہ سے غیر برہمن اور پس ماندہ ذاتوں کو ترجیح دینے کے لئے حکومتی پالیسی نافذ ہوئی تو برہمنوں کے خلاف عوامی تحریک بھی شروع ہوگئی حالانکہ یہ تحریک 1929 میں ہی شروع ہوئی تھی لیکن دستور ہند نے اصولی اور آئینی طور پر اچھوت پن کو ختم کیا۔ اس تحریک اور پس ماندہ ذاتوں کی سرکاری عہدوں میں رعایت کی وجہ سے اعلیٰ ذاتوں کی اجارہ داری بالکل ختم تو نہیں ہوئی لیکن اس میں کمی آئی جس کی وجہ سے برہمن تجارت یا کاروبار کے کسی دوسرے پیشے میں داخل ہونے لگے۔ دوسری عالمی جنگ میں برہمنوں کے لئے ایک وسیع میدان اور مہیا یہ کرایا کہ برہمنوں کی پہلی نسل جو تعلیم سے آراستہ ہوگئی تھی وہ فوج میں بھرتی ہونے لگی اور دنیا کے مختلف حصوں میں بھیجی گئی اس طرح ان میں مغربی تہذیب کے اثرات اور بڑھ گئے۔ دوسری طرف غیر برہمن اور پس ماندہ ذات جو شہروں کی طرف ہجرت کررہے تھے اور سرکاری عہدوں کی سہولت سے ہم آہنگ ہورہے تھے ان میں اعلیٰ ذاتوں کی تہذیب وروایت کو اپنانے کا رجحان بڑھنے لگا تھا۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ طبقہ جو پہلے ہجرت کیا وہ مغربی اثرات سے متاثر ہوا اور جو طبقہ بعد میں ہجرت کیا اس نے اعلیٰ طبقے کی تہذیب اپنانی شروع کی یہاں تک کہ یہ سلسلہ جاری رہا اور اس کا عمل اب بھی برقرار ہے۔

غرضیکہ خاندان ہماری زندگی کے لئے ایک اہم ادارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے ہماری تہذیب وثقافت کی شناخت قائم ہے۔ خاندان کی ہیئت وساخت میں تبدیلی سے ہمارے ثقافتی نظریات واقدار اور ہماری زندگی کے معیارات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس طرح خاندان کی مختلف جہتیں ہیں۔ ہر زمانے کے تاریخ وادب میں خاندان کو سماجیاتی نقطۂ نظر سے پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اردو افسانے میں خاندان کی مختلف جہتوں سے تصویر کشی کی گئی ہے۔

حواشی

(۱) جامع اردو انسائیکلو پیڈیا (سماجی علوم) ص:۲۵۶

(۲) جامع اردو انسائیکلو پیڈیا (سماجی علوم) ص:۲۵۶

(۳) ڈاکٹر جعفر حسن، ہندستانی سماجیات، ص:۲۸

(۴) ڈاکٹر جعفر حسن، ہندستانی سماجیات، ص:۲۹۔۳۰

(۵) سید عابد حسین، قومی تہذیب کا مسئلہ، ص:۱۲۵

(۶) شیخ محمد غیاث الدین، فرقہ واریت اور اردو ہندی افسانے۔۱۹۴۸ تا ۱۹۷۸، ص:۶۵

(۷) شیخ محمد غیاث الدین، فرقہ واریت اور اردو ہندی افسانے۔۱۹۴۸ تا ۱۹۷۸، ص:۶۵

(۸) ڈاکٹر جعفر حسن، ہندستانی سماجیات، ص:۴۵

باب دوم

اوّلیں دور کے اردو افسانوں میں خانگی زندگی کی عکاسی

(بدلتے ہوئے سماجی و تہذیبی اقدار اور خاندانوں میں پیدا ہونے والی کشمکش)

اوّلین دور کے اردو افسانوں میں خانگی زندگی کی عکاسی

جب انگریزوں نے ہندوستان پر اپنا تسلط قائم کیا، تو یہاں ایک ڈھیلا ڈھالا جاگیردارانہ سماج قائم تھا۔ لوگوں کی تھوڑی تعداد شہروں میں رہتی تھی، جو اس برصغیر میں بکھرے ہوئے تھے۔ لوگوں کی بڑی اکثریت گاؤں میں رہتی تھی، اس وقت کے شہر آج کے جدید اور صنعتی طور پر ترقی یافتہ شہروں سے مختلف تھے۔ یہاں رہنے کا مطلب روایتی زندگی سے مکمل انحراف نہیں تھا، گاؤں کی معیشت ایسی تھی کہ لوگوں کو دو وقت کی روٹی مل جاتی تھی۔ افراد اور گروہوں کے تعلقات کا تعین، ان کی حیثیت، کسی خاص خاندان میں پیدائش سے ہوتا تھا اور کسی شخص کے حقوق و فرائض اور تجارت و پیشہ کیا ہیں اس کا زیادہ تر انحصار خاندان پر ہوتا تھا۔

انیسویں صدی میں ہندوستان میں انگریزی حکومت کے توسط سے مغربی تہذیب کا نفوذ بہ آسانی ہونے کی کئی وجہیں ہیں۔ ان میں ایک یہ کہ ہندوستان پر جمود طاری تھا، حکمراں طبقہ کے ساتھ صرف دو طبقے موجود تھے ان میں اشتراک کے مواقع میسر نہیں تھے، حکومت و سیاست کے تئیں عوامی بیداری کی روایت مفقود تھی، دولت و قوت کے لحاظ سے بھی افراد کی تعداد مختصر تھی، روایات کی بندشیں، انسانی خواہشات کے اظہار میں ہمیشہ مانع رہتی تھیں، انسانی ذہن چاہے کسی بھی طرح کی جدت کا موجد ہوتا اسے سماج قبول نہیں کرتا تھا، اور بھی دیگر پیچیدگیاں جس کی وجہ سے ہر انسان کو ہر میدان میں طبع آزمائی کے مواقع کم میسر تھے، اس کے برعکس انگریزی حکومت میں آزادی اور حقوق کا دائرہ وسیع ہوا، شعوری بیداری اور معلوماتی معیار میں بلندی آئی اور تخلیقی و اختراعی قوت کے اظہار کا میدان عوام و خواص کے لئے یکساں طور پر فراہم کیا گیا، اس طرح تہذیبی تغیرات کا ایسا انقلاب آیا کہ خاص کر ہندوستانی معاشرت و تہذیب اپنی اصلیت سے دور ہوتی گئی۔

ہمارے خیال سے ہندوستان میں جمود کا بندھن جونہی ٹوٹا یہاں کے افراد و سماج میں مغربی تہذیب کے تئیں تحریص کا جذبہ پیدا ہوا اور اس بہاؤ میں مغربی تہذیب کی ظاہرداری کے اندر لوگ اس طرح کھو گئے کہ ان میں پوشیدہ مہلک اور مضر اثرات کے امتیاز کا کوئی معیار قائم کرنا مشکل ہو گیا، لیکن بعض ایسے حساس ذہن رکھنے والے دانشور اور ادیب بھی ان میں شامل تھے جنہوں نے مغربی تہذیب کے مضر اثرات کی نشاندہی بہت جلد کر لی اور اسے اپنی تخلیقات

میں بیان کیا۔ جو کہ اخلاقی اور تہذیبی اقدار کو بحال کرنے کا اہم ذریعہ ثابت ہوئے، ان قدروں سے محرومی کی سزا ہندوستانیوں نے آزادی کو کھو کر پایا اور یہ ایک ایسی ہمہ گیر صداقت ہے جس کے لئے کسی سند کی ضرورت نہیں۔ انسانی شناخت کا پیمانہ جسم نہیں بلکہ جسم میں رہنے والی روح ہے اور اس کے خارجی مظاہر ہیں، انہی کے حوالے سے دوسرے رشتے قائم ہوتے ہیں اور جب یہ شناخت باقی نہیں رہتی تو حقیقی معنوں میں یہ رشتے بھی منقطع ہو جاتے ہیں، انسانیت کی معراج یہ ہے کہ روح جسم پر، اور فرض جذبے پر فتحیاب ہو۔ انسانی اوصاف اور اخلاقی اقدار کی معراج اس میں ہے کہ وہ کسی ملک، عہد اور قوم سے وابستہ نہیں ہو بلکہ ہر حساس، باعزت اور غیرت مند دل کی پکار ہو۔

بیسویں صدی کی ابتداء تک ہندوستان کی معاشرتی، سماجی اور خانگی زندگی مغربی تہذیب و اقدار سے بہت حد تک متاثر ہو گئی تھی۔ انگریزوں کی فتح یابی نے ہندوستان کی سیاسی، معاشی، سماجی، خانگی اور تکنیکی وغیرہ بہت سی طاقتوں میں اصلاح و مداخلت کو بروئے کار لایا۔ ان طاقتوں نے ملک کی سماجی اور تہذیبی سطح کو بے حد متاثر کیا۔ مثال کے طور پر ماقبل انگریزی دور میں معیشت کے حوالے سے عوامی بیداری مفقود تھی، لوگ کسی طرح گزر بسر کرنے پر راضی تھے۔ اگر چہ اس میں حرکت پذیری جاری تھی، اور عوام بہتر سے بہتر زندگی کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے لیکن ان میں حرکت پذیری کی رفتار کافی سست تھی، انگریزی دور میں انہوں نے اب روپے کمانے کے مواقع تلاش کرنے شروع کئے۔ حصول دولت کے بعد ان میں اونچی حیثیت حاصل کرنے کا دعوی شروع ہوا اور اس طرح سماجی اور خانگی تبدیلیوں کی تیز رفتاری تیز تر ہوتی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ بیسویں صدی میں ہندوستانی سوسائٹی میں عظیم بدلاؤ آیا، متوسط طبقہ جو نوزائیدہ تھا اس کی شرح تقریباً 10 فیصد تک ہو گئی تھی، اور جس میں روز بہ روز اضافہ ہی ہو رہا تھا، اسی صدی میں زراعت اور گھریلو پیشہ سے جڑے افراد میں کمی واقع ہو رہی تھی، صنعتی عمال میں نچلے سطح کے ورکروں اور اونچے سطح کے وائٹ کالروں کی تعداد کی حرکت و رفتار بڑھ رہی تھی، جس کی وجہ سے ایک الگ تبدیلی یہ آ رہی تھی کہ سماجی، تہذیبی، خانگی زندگی میں کشمکش، طلاق اور single parent family کی شروعات ہونے لگی۔

تہذیبی قدروں کی پامالی یا اس سے انحراف کی واضح شکل کو بیان کرنا ایک دشوار کن مسئلہ ہے کیوں کہ تہذیبی شکل کے کس رخ کو خالص ترقی یافتہ تصور کیا جائے یا کس پہلو کو پژمردہ اور فرسودہ مانا جائے۔ جدید ہندوستان کی ابتدائی تاریخ سے موجودہ صدی کی تاریخ کا موازنہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بعض علامات و اسطورتو یکسر بدل چکے تھے، بعض قدیم روایات قوت اور عمومیت کے اعتبار سے اور بھی پھلے پھولے تو بہت سارے مراسم جدید رنگ سے مغلوب ہوتے نظر آئے۔ تہذیبی اقدار، اور انسانی زندگی کے طریقۂ کار کا انحصار حظے اور علاقے سے وابستہ ہے اور ہندوستان کا جغرافیائی ڈھانچہ اور اس کے اجزا میں ان میل تفاوت اس قدر ہے کہ سماجی، معاشی، خانگی، دیہاتی اور شہری زندگی کے کسی بھی پہلو کی پرکھ اور پہچان بہت مشکل ہے۔ مثلاً اگر آپ بیسویں صدی کی زندگی کا مطالعہ میٹروپولیٹین جیسے شہروں

کے حوالے سے کریں اور تجرباتی طور پر ان کا موازنہ کریں تو بالکل مختلف نتیجے سامنے آئیں گے۔ دہلی میں مغربی فیشن زدگی بھی ہے اور عملی بیداری بھی۔ استحصال کی کئی صورتیں بھی ہیں اور باہمی امداد کے جذبے بھی، یعنی ایک ہی شہر کے مختلف خاندانوں میں بیک وقت تہذیبی اور اور اخلاقی اشتراک کے ساتھ ساتھ روایتی اقدار سے گریز، خانگی زندگی کی کشمکش اور خالص ہندوستانی رنگ و آہنگ کے جذبے بھی مختلف النوع شکلوں میں پائے جا رہے تھے۔

ہندوستان کا عظیم المیہ یہ ہے کہ اس کے معاشی نظام کا بیشتر دارومدار زراعت پر ہے اور سب سے زیادہ لوگ دیہاتوں میں زندگی گزارتے ہیں مگر حکومت کی پالیسی اس عظیم حصے کے لئے ہمیشہ مایوس کن رہی ہے جب کہ وہ حصہ جو کم ہے اور ہر طرح کی سہولیات سے بھی بہرہ ور ہے پھر بھی حکومتی منصوبے کا زیادہ رجحان اسی حصے اور انہی لوگوں کی طرف ہوتا ہے۔ ہندوستان ملکی سطح پر غذائی تحفظ میں ضرور کامیابیاں حاصل کر رہا ہے لیکن غذائی تحفظ کی یہ صورت ملک کی ذیلی سطح پر کھڑے آخری فرد کے لئے ابھی بھی ممکن نہیں ہوا ہے۔ غذائی غیر محفوظیت کے شکار یہ وہی لوگ ہیں جن کی مشقتوں نے ترقیاتی امکانات پیدا کئے ہیں۔ جن کے خلوص نے ملکی سطح کو اعلیٰ معیار عطا کیا ہے۔ اور اس کا بدلہ یہ ہے کہ استحصال، غربت، ظلم و استبداد اور حکومتی بے توجہی کے شکار ہمیشہ یہی لوگ رہے ہیں۔

خانگی زندگی کی ہیئت و ساخت کیا ہیں اس کی روح اور آدرشوں کی کیا نوعیت ہے اور اس میں مشرقی عناصر کی امتیازی رنگت کی کس طرح پیمائش کی جائے گی۔ نیز مغربی اور مشرقی تصادمات اور اشتراک کس کس جگہ ہو رہے ہیں ان کو ہی ماننا اور جاننا اہم مسئلہ ہے۔ صدیوں سے ہندوستان میں خانگی زندگی کی مسلمہ قدروں کو اچھا جانا جاتا رہا ہے اور اس کی وجہ سے افراد کی انفرادیت متعین کی جاتی رہی ہے۔ پیسے کا رواج مشترکہ خاندان سے وابستہ تھا، خاندانی نظام کے تحت جداعلی سے متعلق ہر فرد یکساں طور پر زندگی گزارنے کا حق رکھتا تھا۔ اگرچہ بعض افراد زیادہ محنت کرتے، تو بعض محض بیکاری میں دن گزارتے تھے مگر گزر بسر سب کا ہو جاتا، اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں رشتے اور تعلقات کی کڑیاں ہمیشہ باہم مضبوط رہتیں، ایک کے درد کی وجہ سے دور کے رشتہ داروں پر بھی ایسی ہی محزونی اور اضطرابی کیفیت طاری ہوتی جس طرح اس فرد کے قریبی سے قریبی پر، یہاں تک کہ ماں باپ اس درد میں مبتلا ہوتے۔ مشرقی روایات میں خاندان کے اقدار، کی کافی اہمیت تھی گھر کے تمام افراد ایک دوسرے کا ہر طرح خیال رکھتے کہ اگر کسی کو بھی تکلیف ہوتی تو اس میں ہر فرد برابر کا شریک ہوتا۔ اور امداد کی صورت میں بھی کوئی تعصب نہیں برتا جاتا تھا۔

اردو افسانے میں خانگی زندگی کی عکاسی کے نمونوں کی تلاش و شناخت ایک مشکل موضوع ہے، لیکن اگر غور کیا جائے اور افسانوں پر مختلف زاویے سے روشنی ڈالی جائے تو یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ صنف افسانہ جو کہانی پن سے متصف ہے، اس میں خانگی زندگی کے فسانے قدیم زمانے سے ہی ملتے ہیں۔ جس وقت انسانی وجود ارتقائی منزلیں طے کر رہا تھا اور اشاروں و آوازوں کی عبوری دور سے گزر رہا تھا، کہانی بھی انہیں مراحل میں تشکیل پا رہی تھی اور جس طرح حادثات و واقعات کے وقوع سے کہانی میں نکھار پیدا ہو رہا تھا، اسی طرح آباء و اجداد کے فخر و شرافت کے ذکر سے اس

میں ترقی بھی ہو رہی تھی، کائنات کے اسرار و رموز اور سماجی و تمدنی حقائق سے انسانی شعور ہم آہنگ ہوا اور رشتوں و طبقوں کی شکلیں واضح ہوئیں تو انسانی شعور خیال آرائی اور بیان طرازی کے حدود میں داخل ہوا، اجداد سے طبعی انسیت ہونے کی وجہ سے ان کے کارنامے اور بہادری کے قصے ان کے لئے باعث فخر ہوتے، خود آرائی و خودنمائی کی فطرت نے نسلی برتری کا ان میں احساس پیدا کیا، اسی کے تحت خودسرائی کے واقعات و کارنامے افسانوی رنگ میں ابھر کر سامنے آئے، ان افسانوی رنگوں میں نہ صرف مقامات و انتظامات کے عکس تھے، بلکہ ان میں خانگی زندگی کے عناصر بھی مختلف معنی و مطالب کی صورت میں الفاظ کا جامہ پہنے اور افسانویت سے آراستہ و پیراستہ تھے۔

کہانی اپنی اولین شکل میں محض یک رخی خانگی زندگی کا عکس لئے ہوئے نہیں تھی بلکہ اس میں ارتقائی سفر بھی جاری تھا۔ جیسے جیسے انسانی زندگی لوازمات و ضروریات کی تلاش میں پھیلتی اور بکھرتی گئی، خاندانی اور عمرانی زندگی میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں، انسان مختلف جغرافیائی اور موسمیاتی ماحول سے جوں جوں آشنا ہوا اور جس طرح ان میں اپنے آپ کو رچایا بسایا اسی طرح اس کے رنگ و روپ، قد و قامت، مزاج، طبیعت، رشتہ و تعلق مختلف النوع خصوصیات کے حامل ہوتے رہے۔ خاندان و طبقات کی ہیئت و ساخت بھی تشکیلی ترقیاں کرتی رہی، انسانی نسلی برتری اور حیرت و استعجاب کے افسانے نسلا بعد نسل منتقل ہوتے رہے۔ اگر چہ سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی کہانیوں کو باقاعدہ کہانی کے باب میں شامل نہیں کیا جا سکتا مگر اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اسی کے نتیجے میں کہانیوں کی باقاعدہ تصویر نوک قلم پر آکر ابھری، اور تحریری نمونوں میں آکر دستاویزی صورت میں محفوظ ہوئیں۔

> ''کہانی ہر عہد میں انسان کو پیاری رہی ہیں اور ارتقائے انسانی کے زیر اثر پروان چڑھی ہے۔ انسان جیسے جیسے آگے کی جانب بڑھتا رہا اپنے علم و فضل میں اضافہ کرتا گیا اور تہذیب و تمدن سے آشنا ہوتا رہا کہانی بھی پھلتی پھولتی اور شاداب ہوتی گئی۔ مختلف ادوار میں ماضی سے وراثت میں پہنچنے والی کہانیوں سے استفادہ کیا جاتا رہا کہ کہانی کا ارتقائی سفر مثنویوں اور داستانوں سے شروع ہو کر، ناول اور افسانہ کے روپ میں عہد حاضر تک پہنچا ہے۔''(۱)

مذہبی کتابوں میں تمثیلی حکایتیں دراصل وہ مختصر کہانیاں ہی ہیں جو عوامی تعلیم، روحانی و اخلاقی مقاصد کی وضاحت کا اہم وسیلہ اور پیش رو زندگی و حالات کے عمدہ دستاویز ہیں جن سے دیگر مسائل و کیفیات کے ساتھ ساتھ خانگی زندگی کے مد و جزر اور اس کی ہیئت و ساخت کے نشیب و فراز کو سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔

اردو ادب کے ابتدائی افسانوں میں موضوعات کی وسعت، انسانی زندگی کی وسعت سے کم نہیں لیکن ہم نے صرف ایک موضوع کا انتخاب کیا ہے جو اس دور کے افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں بہت نمایاں طور پر تو نہیں مگر مجموعی تاثر میں اس کے خدوخال کا عکس ضرور جھلکتا ہے، یوں تو افسانے کی تاریخ کے اولین دور میں درجنوں افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا ڈھیر

ہے مگر ہم نے چند مخصوص افسانہ نگاروں کے زیادہ سے زیادہ ان افسانوں کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے جن میں خانگی زندگی کے مسائل، قدیم تہذیبی وسماجی اقدار سے گریز اور ان میں پیدا ہونے والی کشمکش کے نمونے کسی نہ کسی طور پر ملتے ہیں، ان افسانہ نگاروں میں سجاد حیدر یلدرم، راشد الخیری پریم چند، علی عباس حسینی کا انتخاب کیا گیا ہے۔

اردو افسانوں کا دور بیسویں صدی سے شروع ہوتا ہے، اس دور کے پس منظر کی تصویر کشی کی جائے تو بہت سارے ایسے جذبات واحساسات، ملکی حکومت وسیاست کے حالات وکیفیات انتظامی وانصرامی صورت حال اور تعمیری وتخریبی نوعیت کے خدوخال ابھر کر سامنے آتے ہیں جو افسانے کے معرض وجود میں آنے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ خاندان یا خانگی زندگی بھی اس سے الگ نہیں وہ بھی سماج کی اکائی کی حیثیت رکھتے ہیں، ادب کے تانے بانے میں ان کے بھی مسائل شامل ہیں۔

چنانچہ ۱۸۵۷ء کے بعد جب انگریزوں کا تسلط قائم ہوا تو باطنی طور پر اگر چہ تعمیری وترقیاتی امور انجام پائے لیکن معاشرے کے ذیلی سطح پر کھڑے آخری فرد تک اس کا کوئی فائدہ نہیں پہونچا، عوام میں مستقبل کے تئیں یقین کے چشمے خشک ہوتے گئے۔ غلامی کی زنجیروں سے سیاسی وانتظامی بیداری ضرور پیدا ہوئی لیکن زندگی کی ضروریات کی تکمیل کے امکانات دھندلے ہوتے گئے۔ اور جس قوم یا ملک کے عوام میں ایسی بے زاری ہو اس میں انتشار لازم ہے۔

سجاد حیدر یلدرم نے نہ صرف افسانے کی روایت کی داغ بیل ڈالی ہے، بلکہ اردو کو عمدہ اور انوکھے موضوعات اور ایک اہم صنف سے روشناس کرایا۔ انہوں نے افسانہ کی ہیئت وساخت کو اس کے اولیں دور میں ہی اتنا آگے پہونچا دیا ہے کہ اس میں دیگر ترقی یافتہ اصناف کی سی پختگی آ گئی تھی۔ سجاد حیدر یلدرم اگر چہ اس عہد کے مغربی وترکی نظریات کے زیر اثر تخلیقی توانائی کو بروئے کار لا رہے تھے۔ تاہم ان کے افسانوں میں اسلوبیاتی سطح پر رومانیت کا غلبہ تھا لیکن موضوعات ومواد کے اعتبار سے اگر ان کی تخلیقات کا جائزہ لیا جائے تو ان میں خالص ہندوستانی رنگت کے نمونے بھی ملیں گے۔ ان کے افسانے میں رومانوی کیفیت کی جھلکیاں ضرور ہیں لیکن انہوں نے زندگی کی ماہیت اور معنویت کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ سماج کے نظم وضبط، حالات ونظریات، سیاسی وتہذیبی عروج وزوال انسانی حیات کے نشیب وفراز زندگی کے اجتماعی محسوسات اور نسوانی کردار کے استحصال اور ان کے تئیں اصلاحی تجربات وتخلیقات کا عکس بھی ان کی تخلیقات میں موجود ہے۔

سجاد حیدر نے مغرب اور مشرق کے جغرافیائی وفکری فرق کو سمجھا تھا، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے انسانی زندگی پر پڑنے والے ان اثرات کو سمجھانے کی کوشش کی ہے، وہ جانتے تھے کہ ہندوستانی امور میں ترقی اسی طور پر ہو سکتی ہے کہ مغربی اثرات کو ردوقبول کے مراحل سے گزارا جائے کیوں کہ ترقی میں ان مغربی اثرات کے فوائد ومضرات سے وہ بخوبی واقف تھے۔ اسی تناظر میں عالمی مسائل وفکری تصادم کی تفہیم کو انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے اجاگر کیا ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ انگریزوں نے اگر چہ کالونیاں قائم کیں اور ملکوں کو غلام بنالیا۔ لیکن اس نے خود ممتاز اور نمائندہ

اداروں کے تصور کو فروغ دیا۔ اقتدار کی تقسیم اونچے اور نیچے طبقات میں ہوئی۔ انفرادی آزادی کا تصور پروان چڑھا، اس میں شک نہیں کہ زرعی معاشرے کو صنعتی ہماہمی سے بھرپور سماج میں تبدیل کر دیا۔ دیہات کی ویرانی شروع ہوئی، شہروں کو رونق بخشی گئی اور سماج کی پائدار قدروں کو پامال کر کے ہر لحہ بدلنے والے اطوار اور فیشن کو رواج دیا گیا۔

یہ ساری تبدیلیاں ادب اور آرٹ میں رونما ہو رہی تھیں، سجاد حیدر یلدرم نے افسانے کی ابتداء انہیں تبدیلیوں کے زیر اثر کیا، چھوٹے چھوٹے واقعات اور موضوعات کو انہوں نے صنف افسانہ میں پرویا اور رومانیت کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری کو اپنایا۔ انہیں مکمل طور پر رومانی ادیب یا ''فن برائے فن'' کا پرستار نہیں کہا جا سکتا۔ بڑی تعداد میں ان کے افسانوں اور مقالوں سے وسیع نظریات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں ترقی پسند سیاسی، سماجی اور معاشی و تہذیبی شعور واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ وہ تعلیم نسواں اور پردے کی روایتی قید و بند میں جدّت طرازی کے ہمیشہ خواہاں تھے، معاشرے میں انقلابی قسم کے سماجی اور معاشرتی اصلاحات اور خانگی زندگی کے بدلتے اقدار سے متعلق اپنے تجربات و افکار کو تحریری شکل دے رہے تھے، اس طرح سجاد حیدر کے افسانوں میں جہاں رومانی فضا میں نازک اور لطیف جذبوں کے ساتھ مرد اور عورت کے رشتوں کی عکاسی کی گئی ہے وہاں ہندوستانی سماج کے بھرپور نقوش اور مشترکہ خاندان کی روایت اور اس کے مسائل کی بھی تصویریں ملتی ہیں۔ برطانوی حکومت کے قیام کے بعد نئے تعلیمی شعور میں جو تبدیلیاں آئیں اور اس کی وجہ سے معاشرے کی بنیادی اکائی مشترکہ خاندانی نظام میں جو کشمکش پیدا ہوئی، ان تبدیلیوں اور تصادمات کی گونج یلدرم کے افسانوں میں سنائی دیتی ہے۔ اردو افسانے میں رومانیت کے ساتھ حقیقت نگاری کے جو عناصر آئے وہ سجاد حیدر یلدرم کی ہی دین ہے، ور اس کا واضح سبب 1857 کے بعد ہندستانی معاشرہ بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی، ذہنیت، ملکیت، وراثتی و خانگی مجد و شرافت اور اقداری و تہذیبی زوال و انحطاط کی تلخ سچائیاں تھیں۔ ان کے افسانوں میں جہاں ترکی ادب سے حاصل کردہ مغرب کی آزادانہ طرز روش اور جنسی و جمالیاتی حس کے نقوش ہیں، وہیں فرد اور خاندان کی کشمکش اور انفرادی آزادی کی باغیانہ بازگشت بھی ہیں۔

ان کی تخلیقی فکر زندگی کے اہم اور بنیادی مسائل کی تہہ تک نہیں پہونچ سکی تاہم ان کی نظر تعلیم یافتہ طبقہ کے اندر پیدا ہونے والے جزوی مسائل اور گھریلو زندگی کی بہت معمولی پیچیدگیوں پر ہی ہے۔ سماجی اعتبار سے ایک خاص طبقہ کی ترجمانی پر ہی ان کے افسانے کا انحصار ہے۔

اسی ایک خاص طبقے کی جھلک یلدرم نے ''صحبت ناجنس'' میں دو لڑکیوں کے خط و کتابت کے ذریعہ دکھائی ہے۔ اس میں انہوں نے نہ صرف ازدواجی زندگی کے مسائل اور مرد و زن اور شوہر و بیوی کی نفسیات و خواہشات کا ذکر کیا ہے بلکہ ایک ایسی ابھرتی ہوئی ازدواجی زندگی کو بروئے کار لایا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم روایت جس میں عورت کو محاکمہ و موازنہ سے کوئی سروکار نہیں تھا آج تعلیمی شعور نے اسے توڑا ہے۔ اگر چہ اس افسانہ میں شادی کے تئیں والدین کے کردار کو روایتی انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ کسی میں نمائش ہے تو کسی میں محض ظاہر پرستی، سجاد حیدر یلدرم نے

اس میں نئی اور پرانی اقدار کے تصادمات کے ساتھ ساتھ خانگی زندگی میں رونما ہونے والے مستقبل کے حالات کو بڑی خوبی سے درشایا ہے اور مشرقی و مغربی تہذیب میں اختلاط اور اس سے پیدا ہونے والی انفرادی کشمکش اور اجتماعی و جزوی مسائل کی بھی نشاندہی کی ہے۔ مگر انہوں نے مشرق و مغرب کی تہذیبی اقدار کو کسی پر فوقیت نہیں دی ہے۔ جیسے:

''غرض یوں بسر ہوتی ہے میں تو سمجھتی ہوں کہ غیر ملکی باشندے کے
ساتھ میری شادی ہوئی وہ سمجھتے ہیں انہیں ہندوستانی بی بی نہیں ملی۔''(۲)

اس اقتباس میں میاں اور بیوی دونوں کی نفسیات کو انہوں نے پیش کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تعلیمی بیداری نے ایک طرف مغرب کی تمنا تو دوسری طرف قدیم تہذیبی اور ہندوستانی پن نے مشرقیت کی آرزو کو برقرار رکھا ہے۔

اسی طرح اس کا یہ اقتباس:۔

''ابا جان کی بے پروائی سے تم واقف نہیں! عجیب بے پرواہ آدمی
ہیں! ماں جانی نمائش پرست دولت پرست ہیں۔ میں یہاں کیوں بیاہی گئی،
اس سوال کے جواب کی غالباً اب ضرورت نہ رہی ہوگی۔''(۳)

دوسرا اقتباس:۔

''میں دعا کرتی ہوں ان دونوں لڑکیوں کی قسمت میری سی نہ ہو، یہ
تصویر کھینچنے والی، بائیسکل پر سوار ہونے والی لڑکیاں ساکن لڑکوں اور ٹھوس
طبیعت والے خاوندوں کے پالے میں نہ پڑیں۔''(۴)

ان دونوں اقتباس کے موازنے سے یہ اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ والدین جو خانگی زندگی کی اساس ہیں ان میں کس طرح تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں، ان میں دولت کی لالچ پیدا ہو رہی ہے۔، شادی ماں باپ کرتے تھے، فریقین چپ چاپ ان کی باتوں کو مان لیتے تھے، بیوی اور شوہر کی محبت اگر کہیں کچھ تھی تو اس میں کوئی داخلی میلان نہیں، بلکہ ایک خارجی فرض کی ادائیگی تھی، اس عہد میں عشق و عاشقی کا مفہوم ہی سماجی حیثیت سے باہر تھا، ایسے معاملہ میں انفرادی پسند اور ناپسند نہیں بلکہ خاندانی مفاد فیصلہ کن ہوتا تھا۔ اور جب اجتماعی ملکیت کے اوپر ذاتی ملکیت کا غلبہ ہوا اور وراثت کے خیال کے ساتھ ساتھ پدری حق اور یک زوجگی کا رواج ہوا تو شادی زیادہ سے زیادہ اقتصادی مصلحتوں پر منحصر ہونے لگی، مرد کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی ذاتی اوصاف کی بنیاد پر نہیں بلکہ اس کی جائیداد اور ملکیت کی بنیاد پر کیا جانے لگا۔ شادی کو مالی منفعت کا ذریعہ سمجھنے کا جو رجحان موجودہ دور میں ایک لعنت کے طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے، اس کی جھلکیاں سجاد حیدر اس دور کے سماج میں ہی دکھاتے ہیں۔ دوسری طرف لڑکیوں کی پسند و ناپسند کے حق کا تصور اس وقت ہر معاشرے میں مفقود تھا۔ آج بھی ہندستان میں روایتی خاندان کے ایسے نمونے باقی ہیں، جن میں خاص کر لڑکیوں کو شوہر کے انتخاب کے معاملے میں مداخلت کی کسی طرح کی بھی گنجائش کو روا نہیں رکھا جاتا ہے۔ سجاد حیدر یلدرم نے اس دور کے ترقی یافتہ

خاندان کے افراد کے اندر ابھرتی ہوئی اس بیداری کی نشان دہی کی ہے۔ خاص کر لڑکیوں کے اندر شوہر کے انتخاب کے ابھرتے خیالات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مسئلہ ازدواج کے روایتی اور عصری دونوں رجحان کا خاکہ انھوں نے جو پیش کیا ہے اس کا اندازہ اس اقتباس سے ہوتا ہے۔

''دل چاہتا ہے کہ اس مسئلہ ازدواج پر تھوڑا سا وعظ کہوں، پہلے بیاہ شادیوں میں دیکھا جاتا تھا، یہی نہ کہ برہم کفو ہے یا نہیں، ایک برادری کا ہے یا نہیں، اس کفو اور برادری پر سب چیزیں قربان کردی جاتی تھیں۔ پھر اصلاح ہوئی، کفو کا خیال ترک کردیا گیا، تعلیم کا زور ہوا، برتعلیم یافتہ ہونا چاہیے، تعلیم یافتہ ہونا چاہیے کا شور بلند ہوا، تھوڑے دنوں کے بعد اخلاق کی بھی چھان بین ہونے لگی، بس یہاں پہنچ کر اصلاح رخصت ہوگئی۔ گویا اب کوئی کام باقی نہیں رہا۔ لیکن مجھ سے پوچھو تو کوئی کام ہوا ہی نہیں۔ اصلی اصلاح تو جب ہے جب لڑکے لڑکی کے مزاج اور طبیعت کی مناسبت کی پوری پوری چھان بین کی جائے۔...بس اس طرح لڑکے لڑکی کے مزاج کا خیال لازمی ہے۔ امتزاج کے اسباب موجود ہیں یا نہیں، طبیعتوں میں ایسا تضاد تو نہیں کہ میل کھانا مشکل ہو، میرے نزدیک تو سب سے زیادہ اہم یہ سوال ہے،۔ حسن و جمال، مال و دولت تعلیم وتربیت سب کو میں دوسرے درجے پر رکھتی ہوں۔''(۵)

اس اقتباس سے اس دور کی تبدیلیوں کی صورت پوری طرح واضح ہوتی ہے۔ سلمیٰ اور حامد جو ایک، خاندانی نظم و ضبط کے تحت زندگی گزارتے ہیں، ان میں اپنے بچوں کے تئیں ترقی پسند خیالات کے نمونے شروع ہوتے ہیں۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ تعلیمی بیداری سے اب خاندان اور مسئلہ ازدواج میں اصلاحات ہو رہی ہیں۔ اور روایتی طرز زیست کے پیمانے بدل رہے ہیں۔

ہندوستان میں صنعتی ترقی، دیسی پیداوار کی تنزلی اور زراعت کے نظام میں جدت طرازی کی وجہ سے تہذیبی قدروں کی تبدیلیوں میں انقلاب ہوا، سماج بھی حیرت انگیز طریقے سے بدلاؤ کا شکار ہوا، خاندان کی اخلاقی تربیت گاہ اور قرابت داری کے فروغ میں جو کارہائے نمایاں تھے اس کی روح پر پژمردگی طاری ہونے لگی۔ نظام خاندان کے تحت فرد اور سماج دونوں کی تعمیر مثبت ڈھنگ سے ہو رہی تھی اور موجودہ دور میں بھی بعض ایسے خاندان ہیں جہاں خانگی زندگی کے مسلمہ روایات برقرار ہیں۔ اس کی حیثیت کا اگر جدید تناظر میں موازنہ کیا جائے تو بڑے بڑے اصلاحی اور تربیتی اداروں سے کم نہیں، آج دنیا مادی منفعت اور کام و دہن کے لذائذ کو بڑی قیمتی شے سے تعبیر کرتی ہے، اخلاق اور انسانی

قدریں کوئی مستقل چیز نہیں تصور کی جاتیں، لیکن پوری کائنات کو ترقیاتی عروج کی اس خود فریبی کی حقیقت کا اندازہ ہونے لگا ہے، آزادی اور حقوق کی بے جا طرفداری سے لاقانونیت اور غارت گری کا سراب اصلی روپ میں ظاہر ہونے لگا ہے، علامہ راشد الخیری رجعت پسندی اور ترقی پسندی کے انہی تصادمات کو اپنے افسانے میں بیان کرتے ہیں۔

علامہ راشد الخیری کی افسانوی تحریریں اصلاحی اور نسوانی حقوق کے فروغ پر مبنی ہیں۔ علامہ کی تربیت منظّم اور مربوط خانگی زندگی کے زیر اثر ہوئی تھی۔ انہوں نے سماج و معاشرت کی حقیقتوں اور تبدیلیوں کو عمدہ خاندانی تربیت اور روایتی تہذیبی اقدار سے ہم آہنگ گھریلو زندگی میں رہ کر مشاہدہ کیا تھا اور انہیں مشاہدات سے متاثر ہو کر ناول اور افسانے کی دنیا میں انہوں نے قدم رکھا تھا۔ ڈاکٹر نجیب اختر کے تحریر کردہ مونوگراف کا مذکورہ اقتباس:

> ''راشد الخیری نے تو علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اردو افسانے میں معاشرتی اصلاح پسندی کی داغ بیل ڈالی تھی اور مسلم تعلیم یافتہ لڑکیوں کی اخلاقی زبوں حالی اور معاشرتی انحطاط کو اپنا موضوع بنایا تھا اور یوں راشد الخیری نے جو روش ''نصیر اور خدیجہ'' میں اختیار کی تھی۔ اور موضوعات کا جو دھار پکڑا تھا تادم آخر اسے نہیں چھوڑا۔ بہر طور راشد الخیری کا نام اصلاح معاشرت او حقوق نسواں کے لئے جدوجہد کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ راشد الخیری کے یہاں متوسط طبقے کی پیش کش میں عورت موضوع خاص ہے اور آزادی نسواں مقصد خاص جس کے حصول کے لئے عورت کی مظلومیت کو انتہائی دردمندی کے ساتھ سامنے لائے'' (۶)

بدلتے ہوئے حالات کے زیر اثر تخلیق کار میں روایتوں سے بغاوت کا رجحان اور شعوری و لاشعوری طور پر ان تمام حقائق کا احاطہ جو اس زمانے میں اس کے ادراک میں آئے تھے ضروری ہو گیا تھا۔ راشد الخیری نے باضابطہ شعوری طور پر ان حالات کا ادراک کیا ہے اور اپنے افسانوں کے ذریعے ان کا احاطہ بھی کیا ہے۔

ان کا پہلا افسانہ ''نصیر اور خدیجہ'' ہے جس میں ان حالات کی بخوبی پیش کش ملتی ہے۔ نیز اس کی معنویت موجودہ دور کے مسائل سے ہم آہنگ بھی ہے۔ انہوں نے خانگی زندگی کی رو بہ زوال صورت کی تصویر کشی کی ہے اور جاگیردارانہ و آمرانہ خاندان کے کرب کو جس انداز میں پیش کیا ہے اس سے اس دور کے افراد، خاندان، سماج اور ملک کے تاریخی حالات ابھر کر سامنے آتے ہیں، نصیر نہ صرف ملازمت کے سبب سے لاہور یا ملتان کی سکونت کو ترجیح دیتا ہے اور والدین کی موت کے سبب خانگی روایت کو ترک کر دیتا ہے، بلکہ تہذیبی اقدار کی تبدیلیوں سے وہ آگاہ ہے اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ مستقبل میں یہی طرز زندگی اختیار کی جانے والی ہے۔

موجودہ دور میں نیوکلیائی فیملی کا تصور عروج پر ہے۔ راشد الخیری نے اس کے امکانات کی واضح صورت اپنے

پہلے افسانہ ہی میں بیان کر دیا تھا اور آج جس رشتے کی پامالی اور اپنوں سے بے تعلقی کا رجحان پنپ رہا ہے اسے بھی انہوں نے اپنے اسی افسانے میں بیان کہا ہے۔

''آخر میں بھی تو سنوں خطا قصور وجہ سبب کچھ تو بتاؤ ایسی لاپرواہی بھی کس کام کی۔ اچھے سے غرض نہ برے سے مطلب بہن کے تم نہیں بھائی کے تم نہیں۔ صادقہ مرتے مرگئی اور تمہاری صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ اماں رہی نہیں ابا ادھر چلے گئے میں اس قابل نہیں، بڑے بھائی اس لائق نہیں اب تمہارا دلی میں کون بیٹھا ہے جس کو خط لکھو تم تو خدا سے چاہتے تھے کہ کوئی موقع ملے تو ایک سرے سے سب کو عاق کر دوں...(دنیا جہان) غرض کنبہ کا کنبہ اور خاندان کا خاندان چھوٹے اور بڑے بوڑھے اور جوان، مرد اور عورت، بوڑھا اور بچہ ایک بھی اچھا نہیں۔ محبت نہیں مروت ہی سہی بال بچوں کا ساتھ رکھنا گناہ نہیں ہے۔ دنیا جہان میں ہوتی آئی ہے مگر یہ اندھیرا کہیں نہیں دیکھا کہ الگ گھر کرتے ہی سب کو دھتا بتائی۔''(۷)

اس افسانہ میں ان کا محور گھریلو زندگی اور سماجی تبدیلیوں کا انعکاس مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ راشد الخیری کا عہد آج سے بہت مختلف تھا۔ اس دور کے معاملوں اور تقاضوں میں عصری مسائل کے اعتبار سے نمایاں بدلاؤ آچکا ہے، پھر بھی ان کے افسانوں کی افادیت برقرار ہے۔

راشد الخیری کے افسانوں کا محور مشرقی روایات وتہذیب کو قائم کرنے کی کوشش ہے، ان میں خانگی زندگی کی پیچیدگیوں اور ان کے اصلاحی نکات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ انہوں نے ''شہید مغرب'' میں مسلمانوں کے عروج وزوال اور اتحاد وانتشار کی تاریخ کو افسانوی روپ میں ڈھالا ہے۔

بیسویں صدی میں ہندستانی معاشرے کی خارجی صورتیں مختلف النوع طریقے سے بدل رہی تھیں۔ جاگیردارانہ طبقہ جو دیہی علاقوں میں سکونت اختیار کیے ہوا تھا، جب اس کی جاگیرداری سلب ہوئی، تو ایک نئے طریقے سے استحصال کی صورت پیدا ہوئی۔ وہ اس طرح کہ بعض افراد ملکی ماحول سے خود کو ہم آہنگ کرنے کے لیے شہروں کی طرف رخ کرنے لگے۔ بعض صنعتی یا سیاسی ادارے سے جڑے، تاکہ ان کی وضع داری اور شائستگی برقرار رہے۔ جدید اقدار سے وابستگی کے بعد ان کی زندگی اور ان کے عمل میں تبدیلیاں شروع ہوئیں۔ جاگیردارانہ استحصال کے رویے میں جدت آئی۔ علامہ راشد الخیری اس طرح کی تبدیلیوں کی داستان اپنے ایک افسانہ ترقی منازل میں پیش کرتے ہیں۔ اس کہانی میں مرزا ولی بیگ کی آبائی اور خانگی طرز زندگی سے لے کر دولت کے زعم اور حکومت کے نشے سے پر زندگی تک کا بیان ہے۔ مرزا ایک ایسے خاندانی نظم وضبط کا پروردہ تھا جس میں مذہبی رواداری اور روایتی مراسم کے ساتھ ساتھ انسانی اور

اخلاقی جذبہ وقدر کی اہمیت تھی۔ باپ دادا پردادا سکر دادا اور بھی تین پشت قبل سے سلسلہ خاندان کی کڑیوں سے جڑا ہوا تھا۔ مذہب وشرع کی پابندی کا عالم یہ تھا کہ نماز روزے ہر چھوٹے بڑے کے اولیں ترجیحات میں شامل تھے۔ لیکن شہری زندگی کی طرف منتقلی، ظاہر داری وضع داری، لیڈری اور ریفارمری کے مدارج کے حصول میں صرف ''اتنی وضع داری قائم رہی کہ دالان اور سائبان کی مرمت کے سلسلے میں کبھی کبھی مسجد کے معائنے کو چلا جاتا۔'' رفتہ رفتہ تغیراتی انقلاب جو اس کی ذات تک محدود تھا، گھر کی چہار دیواری میں بھی سرایت کرنے لگا۔ راشد الخیری اس کا خاکہ کچھ اس طرح کھینچتے ہیں۔

> ''تہذیب جدید کے دور میں فلاح قوم کی پہلی کوشش وداع مذہب ہے۔ جس کے بغیر ریفارمر کی شخصیت، محنت، قابلیت، ہمت کوئی چیز مسلم ہو ہی نہیں سکتی۔ دوسری کوشش صورت اور ہیئت کا ایک خاص وضع میں ڈھل جانا ہے۔'' (۸)

مرزا ولی چالیس سال کے تھے۔ بیوی بچے اور ماں بہن پر مشتمل ایک بھرا کنبہ اور پورا خاندان تھا۔ بیٹیاں اور بیٹے بھی اولاد والے تھے۔ نواسے اور نواسیاں پوتے اور پوتیاں بیسوں افراد اس خاندان کے ممبر تھے۔ ولی نے اولاً تو دوستوں کی صحبت اور احباب کی رنگت سے متاثر ہو کر خود کو بدلا۔ اس کے بعد گھر میں تغیرات لانے کے لیے سبھوں کو دقیانوسیت سے متصف کرنے لگا، تاکہ خانگی نظام کا ہر گوشہ جدت کے زیر اثر آجائے۔

> ''ریفارمری کا خبط دوستوں کی صحبت احباب کا رنگ ان سب سے متاثر ہو کر بمشکل یا بآسانی قینچلی بدل گیا۔ یہ جتنا انقلاب تھا، گھر کی چہار دیواری کے باہر۔ لیکن ولی جس نقص کو محسوس کر رہا تھا، اور اسی کمی کی تلافی میں ہر وقت منہمک۔ بیوی کو جاہل، بچوں کو بے وقوف ماں کو دقیانوسی اور بہن کو گنواری ہر وقت کہتا۔'' (۹)

اس طرح اس کہانی کا محور مرکزی کردار ہے جو تہذیبی اقدار سے گریز اور خانگی زندگی کی کشمکش کی عکاسی کرتا ہے۔ راشد الخیری ایک زمانہ شناس افسانہ نگار تھے۔ بایں وجہ انھوں نے صرف تبدیلیوں کو ہی اجاگر نہیں کیا، بلکہ ملکی اور خانگی زندگی کے تغیرات سے وہ بہت پہلے ہی واقف ہو چکے تھے۔ خاندان اور سماج کے مستقبل میں ہونے والے واقعات پر بھی گہری نظر تھی۔ اس افسانے میں تبدیلی کی رفتار وحرکت کی تیزی کو اجاگر کیا ہے۔ پہلے ولی خود بدلے پھر اس کی بیوی فیشن زدگی کی شکار ہوئی۔

> ''مرزا ولی جن کو بعض دوست مسٹر ولی کہتے تھے ان لوگوں میں تھا جن کے ہاتھوں میں ترقی قوم کی باگ تھی اور ترقی نام تھا تمول واعجاز کا۔ بلا لحاظ اس کے کہ مذہب رہے یا جائے۔ مردوں میں میاں ولی اور عورتوں میں

بیوی بشیرن دونوں کی لیڈری مسلم تھی۔''(۱۰)

اس کہانی سے ہاجرہ نامی مظلوم بیوہ کی بھی ایک کہانی وابستہ ہے، جو بیوی بشیرن کی بہن ہے۔لیکن بشیرن کو یہ معلوم نہیں رہتا۔انجانے میں شوہر اور بیوی اس کا بھرپور استحصال کرتے ہیں۔اور لیڈری اور دولت کے زعم میں غلط قانونی چارہ جوئی کر کے اس کے مکان کو غصب کرنا چاہتے ہیں۔غرض کہ راشد الخیری نے اس افسانے میں دو خاندان کے نشیب وفراز کے نقوش کو روایتی قدروں کی پامالی کے تناظر میں پیش کیا ہے۔اس میں تخلیق کار کا تخلیقی رویہ جو کہ اصلاح معاشرہ ہے، اس طرح ابھر کر سامنے آتا ہے کہ کہانی کے آخر میں وہ مصنوعی حل نکالنے کے لیے ولی کی ماں کی کردار سازی کرتا ہے۔اور اس کے سہارے ہاجرہ کے استحصال کے خاتمے کی صورت نکالتا ہے۔

دراصل راشد الخیری خود ریفارمری کے کام سے وابستہ تھے اور اس کے لیے وہ صرف مثبت پہلو سے ہی کام لیتے تھے۔لیکن اس وقت کے سماج اور معاشرے میں ایسے افراد کا وجود ہو رہا تھا جو ریفارمری اور لیڈری کے پس پردہ منفی اعمال کا ارتکاب بے پروائی سے کرنے لگے تھے۔اور یہ وہ افراد تھے جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ہندستان میں اس طبقے کا وجود انگریزوں کے بعد ہی عمل میں آیا تھا اسی وجہ سے جدید اور قدیم کے تصادمات شروع ہوے تھے۔اس میں بدلاؤ کے تئیں ایک کشمکش کی صورت تھی۔وہ چاہتا تھا کہ بدلاؤ بھی ہو اور سماجی اور مذہبی رکھ رکھاؤ بھی باقی رہے۔جب کہ ہندستان کے طبقہ اشرافیہ میں قدروں کے تئیں ترک واختیار کا نظریہ بالکل واضح تھا۔علامہ راشد الخیری کو سماج، گھر، خاندان اور خاص طور سے عورتوں کی زبوں حالی، مظلومی اور محرومی کا شدت سے احساس تھا۔وہ ان کی اصلاح وتربیت اور حقوق کی بازیافت کے لیے افسانوں اور ناولوں کے ذریعے جدوجہد کرتے ہیں۔''ایک مظلوم بیوی کا خط''، کثرت ازدواج''سوکن کا جلاپا''بھنور کی دلہن''، بھاوج کا کینہ''، اس کے علاوہ اور بھی ان کے دیگر افسانے ان کی ایسی تخلیقات ہیں، جن میں خانگی زندگی اور گھریلو زیست کے مسائل کثرت سے ملتے ہیں۔وہ تعلیم نسواں کی پیروی بھی کرتے ہیں اور تعلیمی بیداری کے نتیجے میں ہونے والی قدروں کی پامالی کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔

افسانے کے فنی لوازمات میں یہ شامل ہے کہ اس کا نام موضوع کی مناسبت سے ہو۔راشد الخیری موضوع کو افسانہ کے سانچے میں ڈھالنے کے بعد ایک خوب صورت اور موزوں نام دیتے ہیں۔سرخی کے ذریعے ان کے افسانے کے مرکزی خیال اور مقصد کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔کیوں کہ ان کے افسانوں میں خانگی، سماجی اور گھریلو موقع ومحل کا استعمال کثرت سے ہے۔وہ اسی موقع اور محل کے افراد مثلاً ماں باپ، بھائی، بھابھی، دیور، بھاوج، سوکن، خالہ، ماما، بیوی، شوہر کو خاندانی رشتے میں جوڑ کر واقعے کی بناوٹ کرتے ہیں۔اور افسانے کی سرخی بھی انھی رشتوں سے قائم کرتے ہیں۔بایں وجہ ان کے موضوعات سرخی اور کردار سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔جس سے خانگی زندگی کے بکھراؤ اور تہذیبی و روایتی اقدار سے گریز کی جھلکیاں نمایاں ہوتی ہیں۔

علی عباس حسینی اولین دور کے افسانہ نگاروں میں اہم مقام رکھتے ہیں، جس مقامی رنگ کی ابتداء پریم چند نے کی

تھی اس کو وسعت دینے میں حسینی صاحب کا اہم رول ہے۔ ہندوستان کی سماجی زندگی اور اس کے جزوی مسائل کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کرتے ہوئے انہوں نے اپنے افسانوں میں دیہی زندگی کے ساتھ ساتھ شہری حالات کا بھی بخوبی جائزہ اپنے افسانوں کے ذریعہ لیا ہے، اپنے دور کے دیہات کی خانگی زندگی کے مسائل اور شہر میں پرانی اقدار سے گریز اور کشمکش کو علی عباس حسینی نے افسانوں کا بنیادی موضوع بنایا ہے اور دیہی و شہری طبقہ کے خاندانوں کی صورت کو مختلف زاویوں سے پیش کیا ہے، انہوں نے خانگی زندگی کی معیشت، اتحاد و افتراق اور تعلیمی بیداری کے رجحانات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مشترکہ خاندان کے سماجی و تہذیبی نقوش کو بخوبی اجاگر کیا ہے۔ افسانہ ''صغیر کفن'' شہری خانگی زندگی کے ایسے پیچیدہ مسائل پر روشنی ڈالتا ہے جس میں جدید تعلیم، مغربی ثقافت، مشرقی روایات اور فطری حالات و کیفیات سے متصادم ہو کر اقدار کی کشمکش شروع ہوتی ہے، اگر چہ علی عباس حسینی نے مشرقی روایات کی ترجیحات پر ہی زیادہ زور دیا ہے لیکن کہیں نہ کہیں تصادم کے وہ اثرات جو خانگی یا انفرادی زندگی پر مرتب ہوئے ہیں ان کو بروئے کار لاتے ہوئے خاندان میں پیدا ہونے والی کشمکش اور سماج میں بدلنے والے قدروں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ ان کے افسانے نظریاتی طور پر سماج کی مکمل ہیئت کا احاطہ کرتے ہیں لیکن اس ضمن میں خاندان، گھر اور فرد کی کہانی بھی پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس طرح ان کے بیشتر افسانے موجودہ صورت حال کے پس منظر میں پورے ہندستان کی تہذیبی، ثقافتی اور خانگی وحدت کے شکست و ریخت کی تصویر پیش کرتے ہیں۔

علی عباس حسینی کی خصوصیت یہ ہے وہ تبدیلیوں کے سرچشمے اور مغربی اثرات کے نکات کی تلاش بہت جلد کر لینے اور پھر اس کو مشرقی واقعات سے ہم آہنگ کر لینے کا فنکارانہ جوہر دکھاتے ہیں لیکن فوراً مغربی زندگی سے انحراف اور مشرقی روایات سے لگاؤ کی ایک ایسی تصویر پیش کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے وہ کردار جو مشرقیت سے کلی طور پر خالی ہو گیا تھا اس میں تقلیب و تنسیخ کی قوت عود کر آئی ہے اور وہی کردار ماضی سے بالکل مشابہ ہو کر بالآخر مشرقی روایات کو ہی ترجیح دینے لگا ہے۔

علی عباس حسینی کا افسانہ ''آئی سی ایس،، میں بدلتے ہوئے سماجی اور تہذیبی قدروں کو تعلیمی ترقی کے تناظر میں بیان کیا گیا ہے، اس کا مرکزی کردار وحید بہت معمولی خاندان، دیہاتی تہذیب، اور زراعتی پیشے سے نکل کر تعلیمی میدان میں ترقی کر کے انگلینڈ جیسے ترقی یافتہ شہر میں پہنچ جاتا ہے اور وہیں ایک مالدار ہندستانی لڑکی سے شادی کر لیتا ہے، پھر جب وطن لوٹتا ہے تو گھر نہ جا کر سسرال میں ہی رہتا ہے اور اسی جگہ ملازمت بھی کرنے لگتا ہے، اب اسے گاؤں کی تہذیبی، سماجی اور رہائشی طرز پسند نہیں آتا۔ اقتباس:

> ''صاحبزادہ کی اجازت اور جہاں آرا بیگم کی پسندیدگی سے اس نے وہیں (انگلستان میں) بیاہ رچایا اور نئی دلہن ساتھ لے کر ہندوستان پلٹا چونکہ دل میں دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں افلاس اور دیہات کا پول نہ کھل جائے اس

لئے ہندوستان میں پہونچنے اور دہلی حضور وائسرے کے صدر دفتر میں تعیناتی
کا درمیانی زمانہ ریاست مہیدر پور میں سسرال ہی بسر کیا اور گھر لکھ بھیجا کہ
''میں فی الحال مکان نہیں آ سکتا لیکن برابر والد کے لئے خرچ بھیجتا رہوں گا
کسی کو میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں ہے۔''(۱۱)

علی عباس حسینی کو اس کردار کی مغرب زدگی اور مشترکہ خاندان کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے آرٹیفیشیل Solution ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ جس کے لیے وہ اس کی بیوی کی کردار سازی کرتے ہیں۔ اور اس میں مشرقی روایات کی پاسداری کے جذبے کو ابھارتے ہیں۔ اور اپنا نظریاتی توازن برقرار رکھنے کے لیے اسی کے سہارے وحید کے اندر ماضی سے وابستگی کا ذوق ابھارتے ہیں۔ جیسے وحید کے مشاغل کا وہ ذکر کرتے ہوے لکھتے ہیں:

''وحید دہلی میں لاٹ صاحب کے دفتر میں کام کرنے لگا۔ وہاں کے
مشاغل بڑے بڑے آدمیوں سے ملنا جلنا، راجگان، مہاراج اور والیان
ریاست کی پارٹیاں ایٹ ہوم، ڈنرس سنیما، تھیٹر، کھیل، تماشے غرض دل
چسپیوں میں نہ کسی طرح کی کمی تھی اور نہ اس کی وجہ سے اتنی فرصت کہ نئے
رشتے داروں اور عزیزوں کی زیادہ فکر کی جاے۔''(۱۲)

اس کے بعد ہی وحید کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ بیگم، وحید کی ماں کا خط پڑھ کر بہت متاثر ہوتی ہے۔ اور سسرال جانے پر آمادہ ہوتی ہے۔ وہ وحید سے کہتی ہے کہ آپ نے اب تک مجھے سسرال والوں سے نہیں ملایا۔ اس وقت وحید جو بیگم کو سمجھانے کے لیے گفتگو کرتا ہے جس سے تعلیمی ترقی کے بعد نوجوان نسل میں پیدا ہونے والے تغیرات کی بخوبی عکاسی ہوتی ہے۔ بیگم کے سوال پر وحید کہتا ہے:

''جب سے ہندستان پلٹ کے آیا تمہارے میکے گیا، پھر وہاں سے
ملازمت پر چلا آنا پڑا۔ یہاں کے کاموں میں کچھ اس طرح پھنس گیا کہ
...وہ بات کاٹ کر بولی، کہ ماں باپ اور بھائیوں سے بھی نہ مل سکے۔ اور نہ
بیوی کو ملا سکے۔ وحید کی ذہانت کام آئی اس نے ذرا مسکرا کر کہا آج یہ دفعتا
آپ کو سسرال کیوں یاد آ گئی۔ کیا کسی نے خط لکھا ہے۔ بیگم بولی جی ہاں۔
میں تو انسان ہوں ہی نہیں کہ مجھے کوئی فکر ہوتی۔ بارہا آپ سے پوچھا۔
آپ نے کہا کسی دن اطمینان سے باتیں ہوں گی تو بتاؤں گا۔ آپ مجھے
انسان نہیں سمجھتے یا اپنے گھر والوں کو جانور سمجھتے ہیں۔ وحید نے ذرا متانت
سے کہا بھئی ہے تو یوں ہی کہ تم ان لوگوں سے مل کر کچھ خوش نہ ہوگی۔ نہ وہ

باتیں کرنا جانیں، نہ آداب وتہذیب سے واقف۔ نہ ان کے رہنے سہنے
کا طریقہ ہم لوگوں سا۔'' (۱۳)

اس عبارت سے سماجی اور تہذیبی اقدار سے گریز اور چھوٹی فیملی کے آغاز کی جھلکیاں بخوبی نمایاں ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے بعد بھی بیگم چونکہ جانے پر آمادہ تھی اس لیے وحید بھی زیادہ اصرار نہ کر سکا۔ وحید جس طرز رہائش اور جس تہذیب وتمدن کا پروردہ تھا اس سے آنکھیں چرا رہا تھا۔ لیکن اس نے کسی طرح پیسوں کی مدد سے گھر والوں کو نئے طریقے کے انتظامات کا حکم دیا۔ ادھر بیگم کے سسرال جانے کا حتمی فیصلہ ہو جانے کے بعد تیاریوں میں لگ گئی۔ اس دوران وہ سسرال والوں کے ہر فرد سے آگاہ ہونا چاہتی تھی، تاکہ سبھوں کے لیے کچھ خرید وفروخت کیا جائے۔ وہ وحید سے اس سلسلے میں بار بار سوال کرتی رہتی جس سے کہ وہ کبھی عاجز بھی آجاتا، لیکن ماضی میں کھوتا چلا جاتا۔

''بعض وقت ان (بیوی) کے سوالات کا جواب دیتے دیتے عاجز
آجاتے تھے۔ لیکن ساتھ ساتھ بیگم کی اس غیر معمولی دلچسپی لینے کا نفسیاتی
اثر ان پر بھی شروع ہوا۔ سفید رنگ کا خون بدلنے لگا، فطرت میں جو اپنوں
سے، اپنے ماں باپ، بھائی بہن سے ہمدردی اور محبت تھی جو آئی سی ایس
کے مخملی پردوں سے ڈھک گئی تھی جس پر انگلستان اور ہندستانی سکریٹریٹ
کے ماحول نے ایک نیا طمع چڑھا دیا تھا۔ بیگم کی کرید نے اس مخمل کو کرید
ڈالا۔ بار بار کے سوال وجواب سے ملمع اتر گیا، خلوص ویگانگت جگہ جگہ سے
جھلکنے لگی۔'' (۱۴)

اس اقتباس سے اس دور کی سماجی اور خانگی زندگی کی موجودہ کیفیت کا اندازہ اس طور پر ہوتا ہے کہ ہندستان کے وہ افراد جو متوسط طبقے میں داخل ہو رہے تھے، ہندستانی تہذیب وتمدن سے وابستگی کا جذبہ ان کے دل کے نہاں خانے میں کہیں نہ کہیں موجود تھا۔ پھر بھی ان کی وجہ سے سماج اور معاشرے کے ساتھ ساتھ خاندان کے اندر نئی نئی قدریں داخل ہو رہی تھیں۔ علی عباس حسینی نے اس افسانے کے ذریعے اس عہد میں بیرون ملک میں تعلیم حاصل کرنے اور سرکاری ملازمت اختیار کرنے کے رجحان کو اجاگر کیا ہے۔ اور اس رجحان کے نتیجے میں ہندستان میں متوسط درجے کے معاشرے کی کشمکش کو واضح کیا ہے۔ بقول شارب ردولوی:

''ہندوستانی یہ چاہتے تھے کہ وہ اپنی مردہ تہذیبی روایات کو سینے سے
لگائے رکھیں اور اس شکست خوردہ تہذیب کو نئی تہذیب سے ٹکرا کر پاش پاش
نہ ہونے دیں ان میں بعض نئی باتوں کو قبول کرنے کا رجحان آچلا تھا لیکن وہ
مغربی تہذیب میں بالکل جذب ہونا نہیں چاہتے تھے۔'' (۱۵)

دوسری طرف اس دور میں عورتیں جو تعلیم سے آراستہ ہو رہی تھیں بالخصوص انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے والی عورتیں ان میں مردوں سے زیادہ روایتی اقدار سے گریز کی شدت پائی جا رہی تھی۔ لیکن علی عباس حسینی کا اس افسانے کے اندر بیگم کو ملکی طرز زندگی سے دلچسپی پیدا کرنا دراصل اس دور کے افسانوی ادب کے رجحان کی وجہ سے ہے۔ جس میں ادیب روایتی تہذیب و قدر کو بکھرنے سے بچانا چاہتا ہے۔ اور تعمیری نقطۂ نظر پر زیادہ زور دیتا ہے۔ حالاں کہ اس سے قبل کے تخلیق کار مثلاً راشد الخیری، پریم چند، یلدرم، مجنوں گورکھ پوری، نیاز فتح پوری اور سدرشن وغیرہ نے عورتوں میں تبدیلی کی حرکت و رفتار کو اسی انداز میں پیش کیا ہے۔ جس طرح ان میں بدلاؤ پیدا ہو رہے تھے۔

قدروں کی تبدیلی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر چہ برطانوی سامراج نے جاگیردارانہ نظام کی آمریت اور غلامی کی روایت کو ختم کر دیا تھا، لیکن نئے سیاسی اور معاشی نظام اور آئینی طور طریقے خاص کر زراعتی نظام کی جدت نے استحصال پسندی کی روپ کو پہلے سے بھی زیادہ بھیانک شکل دے دی تھی۔ اس نے ایسے نئے ریفارمر اور لیڈر کو جنم دیا تھا جو گاؤں اور شہر کے ہر گوشے میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور غریبوں کی معاشی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر ہر طرح کا استحصال کر رہے تھے۔ بہر حال علی عباس حسینی کا یہ افسانہ موضوعات و مواد کے اعتبار سے بدلتے ہوئے سماجی، تہذیبی اور معاشرتی قدروں کے ساتھ ساتھ خانگی زندگی میں پیدا ہونے والی کشمکش کا عمدہ نمونہ ہے۔ فنی اعتبار سے یہ ایک مکمل افسانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے مواد میں بھی گہرائی ہے۔ کیوں کہ جو افسانہ فنی اعتبار سے جتنا زیادہ مکمل ہوتا ہے، اس کے مشمولات میں بھی اتنی ہی گہرائی اور سچائی ہوتی ہے۔

اس کے بعد جب یہی کردار گاؤں آتا ہے تو ماضی کی یادوں میں کھوتا چلا جاتا ہے اور باری باری سے نئی زندگی کی نئی قدروں کو بھول جاتا ہے۔

غرض اس افسانہ کا مرکزی کردار ''وحید'' ایک ایسے مشترکہ خاندان کا پروردہ ہے جہاں اس نے محبت، مساوات، مذہبی رواداری، انسانیت اور بھائی چارے کے ساتھ ساتھ زراعتی پیشے میں ڈوب کر اس زندگی کا بھرپور لطف لیا تھا۔ لیکن جب اس کے اندر علمی بیداری، مغربی تہذیب سے آگاہی اور شہری و ملازمتی زندگی کا پروان چڑھا تب اس کی زندگی یکسر بدل گئی۔ وحید کا کردار بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے بعد ہندوستان میں پیدا ہونے والی علمی بیداری کا عکاس ہے۔

علی عباس حسینی نے سماج اور تہذیب کی بدلتی قدروں کو ثقافتی سیاسی اور معاشی تناظر میں دیکھا ہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ ''ندیا کنارے'' میں یوپی میں بدلتی قدروں اور سماج پر مقامی سیاست کے اثرات کو افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ خاص کر کانگریس حکومت کا یوپی میں جب غلبہ ہوتا ہے، تو ترقیاتی منصوبوں کا نفاذ عمل میں آتا ہے جس کے نتیجے میں زندگی کے پہلو نئی سمت کروٹ لیتے ہیں۔ علی عباس حسینی نے ان واقعات کو اس مجموعے میں بیان کیا ہے۔ ہمارا گاؤں اور دوسرے افسانے، ہندوستان کی دیہی معاشرت اور ان کی گھریلو و خانگی زندگی کا مرقعہ پیش کرتے ہیں۔ ان

کے افسانے اس خیال کے ترجمان ہیں کہ موجودہ تہذیب میں ربط کی کمی ہے، اس میں قدریں اور عقیدے باقی نہیں رہے اور زندگی بے معنی بن گئی ہے۔

پریم چند نے اردو افسانوی ادب کی تاریخ میں اپنی موجودگی کا ثبوت ایسے زمانے میں دیا جب تہذیب و معاشرت میں تغیر کا سلسلہ شدت سے جاری تھا اور زندگی کے ہر شعبے جدت پذیری کے ساتھ ساتھ تذبذب اور کشمکش کی عمومی صورت اختیار کر رہے تھے، انگریزی سامراجیت کا استحکام قوی ہو چکا تھا، تہذیبی و معاشی عناصر میں منفی و مثبت رویے کی آمزش ظاہر ہونے لگی تھی، مسلمہ مشرقی قدروں کا انجماد حرکت میں آ رہا تھا، نئے طبقات کے وجود نے پرانے طبقات کی اہمیت کو رد کرتے ہوئے سماج کو طبقاتی کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس دور کے اکثر ادیبوں میں یہ جذبہ شدت سے کارفرما تھا کہ مغربی تہذیب اور اس کی زندگی کی ناپائیداری کا احساس لوگوں میں پیدا کیا جائے اور اس کی طرف مائل ہونے سے روکا جائے۔

انگریزوں کی پھیلائی ہوئی ہندو مسلم کے درمیان منافرت سے جو تہذیبی اور مغربی تشدد قائم ہو رہا تھا، مشترکہ رسم و رواج جداگانہ حیثیت اختیار کر رہے تھے اور ہندوستانی تہذیب کے تحت پروان چڑھنے والی انسانی صفت یعنی سادہ لوحی، فراخ دلی، مروت، غیرت، انا، خودداری، آپسی بھائی چارہ اور مذہب پرستی و ذات سے پرے ایک دوسرے کی مدد اور ایک دوسرے کے غم و خوشی میں شریک ہونے کا جذبہ وغیرہ فنا ہوئے جا رہے تھے۔ تہذیبی اور انسانی قدروں کے فقدان کے اسباب وہ ایک طرف انگریزی نظام حکومت سے وابستہ اہل کاروں، مختاروں اور ان کے کارندوں میں تلاش کرتے ہیں تو دوسری طرف مشرقی روایات اور توہمات سے وابستہ جہالت اور زراعت کے نئے طریقوں کی عدم قبولیت کو قرار دیتے ہیں۔

خانگی زندگی اور تہذیبی اقدار میں تبدیلیوں کی ایک بڑی وجہ اس دور میں یہ تھی کہ کاشت کاروں کی مالی حالت خراب ہوتی گئی، وہ غیر تعلیم یافتہ بھی تھے مزید یہ کہ خاندان کی وسعت کی وجہ سے ان کی اصل پونجی زمین کے بٹوارے بہت زیادہ ہوتے گئے۔ اب یا تو صنعتی اداروں سے ان لوگوں نے وابستگی اختیار کی یا سیاسی قوت اور تجارت و حرفت سے اپنے آپ کو جوڑا یا تعلیمی میدان میں اترے یہ ایسے رجحانات ہیں جن کی وجہ سے نہ صرف ایک ادنی کسان اور ادنی خاندان شہری تہذیب اور طبقۂ اعلی کی طرز زندگی کو اپنانے کی کوشش کرنے لگا اور اپنے اندر اعلی ذاتوں اور اعلی خاندانوں کی تہذیب اور طرز زندگی کی ہمسری کا جذبہ ابھرا بلکہ توہمات سے انحراف اور فرسودگی سے احتساب کی راہیں بھی کھلیں۔

اس کے نتیجے میں خاندان کی اہمیت گرتی گئی اور انفرادی طور پر یا نیوکلیائی فیملی کے تحت زندگی گذارنے کے رجحانات پیدا ہوئے۔ خاندان میں بٹوارے اور جدا ہونے کی خواہشات جنم لینے لگیں جس کی وجہ سے تہذیبی قدروں میں پامالی اور ترقی پسندی اور رجعت پسندی کے تہذیبی منظر ناموں میں بدلاؤ کا سماں پیدا ہوا۔

''ادب تاریخی ارتقاء کا ایک جز ہے کلچر کا تسلسل اور تاریخ کا سلسلہ صرف ادب ہی کی بدولت قائم ہے اور یہ تسلسل تاریخ اور تمدن کی طرح ادب میں بھی برابر کارفرما رہتا ہے، اس طرح گویا ادبی تجربہ کا تسلسل، کلچر اور تاریخ کے تسلسل پر منحصر ہے۔ کلچر اور تاریخ میں انقلاب پیدا ہوتا ہے تو ادب پر اس انقلاب کا تاثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔''(۱۶)

پریم چند کے افسانوں میں پائے جانے والے موضوعات کا اگر جائزہ لیا جائے تو مجموعی طور پر ان کے افسانوں میں ہندوستان کی سماجی و معاشی، سیاسی جدو جہد، مذہب کی آڑ میں استحصال اور انتہا پسندی کا جذبہ، عورتوں کی بدحالی، جنسی بے راہ روی، محنت کشوں اور مالکان کے درمیان پیدا ہونے والے مسائل اور گھریلو ازدواجی زندگی کے ساتھ ساتھ خانگی مسائل اور اس میں ہونے والی کشمکش کے نمونے جا بجا ملتے ہیں۔

پریم چند نے تہذیب اور خاندان کی روایات کو مختلف زاویوں سے پیش کیا ہے۔ دیہی معاشرت تو ان کے افسانے میں ملتی ہی ہیں اعلی درجے کی سوسائٹی اور اس کے اچھے و برے اثرات کو بھی موضوع بنایا ہے۔

ان کے بیشتر افسانے متضاد ذہنی کیفیتوں کا احاطہ اور قدیم تہذیب کی مسماری کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔ ترقی پسند اور رجعت پسند تہذیبی اقدار کے معرکہ کو پریم چند نے ایسا پیش کیا ہے کہ ان کے اندر چھپے ہوئے تہذیبی درد کے آثار پھوٹنے لگتے ہیں۔ اور عہد زوال کے تہذیبی منظر ناموں کو بیان کرنا، بالکل فطری لگتا ہے۔

زندگی کے رنگ اتنے مختلف ہیں کہ اس کے انتظامات و التزامات کی نوعیت کو متعین کرنا ممکن نہیں کیونکہ عوام مختلف طبقوں میں منقسم ہے اور ہر طبقہ کے الگ الگ مسائل ہیں، ہر فرد کی فطرت و ذہنیت جداگانہ ہے جس کی وجہ سے ہر ایک کی جذباتیت بھی مختلف ہے، کسی بھی ملک کی ریاستی سطح پر ان کے باشندوں کی تہذیبی و ثقافتی اور فطری مناظر کا اختلاف، روایات ماحول اور طرز زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کی عملی زندگی میں اس کا عکس نمایاں ہوتا ہے۔

''افسانے کا اپنا کوئی مخصوص موضوع نہیں ہوتا۔ دنیا اور انسانی زندگی سے متعلق کوئی بھی واقعہ، جذبۂ احساس، تجربہ، معاہدہ اس کا موضوع بن سکتا ہے۔ گویا انسانی زندگی جتنی وسیع ہے اتنی ہی وسعت افسانہ کے موضوعات میں پائی جاتی ہے جو زندگی کے سچے، حقیقی اور فطری مرقعہ پیش کرتے ہیں ان کا مقصد زندگی کی وسعتوں میں سمٹی ہوئی تمام موجودات کی تشریح و وضاحت، ان کا تجزیہ، توجیہ و تعلیل پیش کرنا ہے۔ ماضی حال مستقبل تینوں زمانوں کے مشاہدات و تجربات سمٹے ہوتے ہیں جن کے ذریعہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔''(۱۷)

پریم چند اپنی تخلیقی زندگی میں مختلف رجحانات سے ایسے متاثر ہوئے کہ وہ اثرات ان میں محرک بنے۔اس کی وجہ سے ان کے موضوعات میں تنوع آیا۔ دیگر موضوعات سے قطع نظر ان کا ایک اہم موضوع سماج اور معاشرے میں مشترکہ خاندان کی روایت، اس کے مسائل اور اس کی تہذیبی وروایتی قدروں سے انحراف کی صورتیں بھی ہیں۔

ہندستان کے سماجی ڈھانچہ میں خاندان ایک بنیادی اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔لیکن جس طرح انگریزی حکومت کے اپنی اصولوں نے نئے سیاسی، معاشی اور زرعی نظام قائم کیا تھا اس نے نہ صرف زراعت ومعیشت کو متاثر کیا بلکہ گاؤں کے معاشرے کی اس بنیادی اکائی مشترکہ خاندان کی روایت کو بھی متزلزل کر دیا تھا۔ اگر چہ تغیرات کا یہ طوفان یک بارگی نہیں آیا بلکہ ابتدائی سطح پر اس تغیرات کو جوان خاندانوں میں تھے اور جنھوں نے نئی تعلیم اور نئے ملازمتوں سے خود کو ہم آہنگ کر کے محض حصول زر کے نئے ذرائع کی تلاش میں نکلے تھے۔ وسائل کی جدت نے اگر چہ خاندان کی مالی حیثیت میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔لیکن خاندان کی روح کو مجروح کرنے لگا تھا۔

انفرادی ترقی شخصیت کی آزادانہ تعمیر وتشکیل اور خود اعتمادی وخود کفالتی کے لیے نیا باب وا کرتے ہیں۔ پرانے نظام کی مناسبت سے مشترکہ وسائل، مشترکہ ترقی اور مشترکہ تربیت کے اصول پر عمل کرتے ہوئے خاندان وروایت سے بندھا ہوا تھا اس لیے اس میں خاندان کے نشیب وفراز ممبران خاندان کے طعنہ وتشنیع کے تلخ وشیریں کو بھی تحمل وبردباری سے حل کر سکتا تھا۔لیکن نئے طرز وسائل اور تہذیب وقدر سے وابستگی کے بعد خود پرستی، خود کفالتی اور شہری زندگی چھوٹے خاندان کی طرز زیست نے اس مشترکہ خاندان اور روایتی تہذیب ومعاشرت سے سمجھوتے کے امکانات محدود کر دئے تھے۔

برداشت کے دائرے میں کمی اور سمجھوتے کے امکانات کے سمٹتے ہوئے حدود اس دور کے مشترکہ خاندان میں کشمکش اور انتشار کی بڑی وجہ سمجھی جاسکتی ہے۔ پریم چند نے ''بڑے گھر کی بیٹی'' میں ایسے ہی مشترکہ خاندان کے رشتوں کے تصادم کو پیش کیا ہے۔لیکن پریم چند کا آدرش اس روایات کی شکست وریخت کے بنیادی اسباب سے واقفیت کے باوجود خاندان کی گرتی ہوئی دیواروں کو ستونی قوت فراہم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سری کنٹھ کو ہندی اور شائستہ بتاتے اور لال بہادر کو اجڈ گنوار اور غیر مہذب، اس کے باوجود اپنی بسری سنگھ سے ہی الگ ہونے کا فیصلہ صادر کرواتے ہیں اور چھوٹے بھائی لال بہاری کو بدنام وشرم سار کیونکہ پریم چند کو متوسط طبقہ کے بدلتے ہوئے قدروں کا احساس ہے۔ وہ عورت کو ''بڑے گھر کی بیٹی'' کا لقب دیتے ہیں۔اور یہ بڑے کو مشترکہ خاندان کی علامت کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔اور اس مشترکہ خاندان کو ٹوٹنے سے بچانا چاہتے ہیں اور عورتوں کی اصلاح بھی کرنا چاہتے ہیں، تاکہ وہ عورتیں جو بڑے گھر سے تعلق رکھتی ہیں ان میں مشترکہ خاندان کے تحفظ کا جذبہ ابھرے۔ بیٹی سنکو کا کردار سازی خاندان کے تحفظ میں سربراہان خاندان کی خاندان میں عدم مداخلت کو بحال کرتا ہے۔اگر چہ پریم چند اس کو اضح انداز میں بیان نہیں کرتے کیونکہ اولیں افسانہ نگاروں کی ایک خاصیت تھی کہ وہ بکھراؤ انتشار کی صورت میں بھی مصنوعی حل ڈھونڈ نکالنے جتن کرتے ہیں جب کہ چوتھی اور پانچویں دہائی میں واقعہ کو اضح طور پر برتنے کا اہتمام دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہمارے خیال

سے افسانے کا یہ طرز بیان سماج و معاشرہ کی ہیئت و ساخت کی بنیاد پر قائم تھا۔ آپ دیکھیں گے کہ بیسویں صدی کی ابتدا میں فرد سماج اور خاندان تغیرات کے تئیں کشمکش میں مبتلا نظر آتے ہیں جب کہ انہی فرد، سماج اور خاندان کے اندر بعد کی دہائیوں میں تغیرات تبدل سیل رواں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

پریم چند کا افسانہ ''بیٹی کا دھن'' بھی مشترکہ خاندان مشترکہ ذرائع آمدنی اور مشترکہ وراثت کی ذمہ داریوں سے انحراف کی عکاسی کرتا ہے۔ سکھو چودھری ان بدلتے ہوئے رشتوں اور قدروں کے عرفان سے متفکر ہے ان کے بیٹے زمین کی محنت سے دستبردار ہونا چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ لگان کی ادائیگی کی بھی نہیں سوچتے جس سے مشترکہ خاندان خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ اس کی روایت کے بکھرنے کے امکانات دکھنے شروع ہو جاتے ہیں۔ سماج میں خاندان کی حیثیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک طرف سکھو چودھری کو اس روایت کے بکھرنے سے اپنی سماجی حیثیت کے کمزور ہونے کا غم دامن گیر ہوتا ہے تو دوسری طرف اس کی بیٹی گنگا جل کو اپنے باپ کی عزت و آبرو کو سماج میں برقرار رکھنے کا خیال سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

پریم چند نے اس افسانے میں خانگی روایت کے تحفظ کی خاطر بیٹی کے اندر اپنے زیور کو قربان کرنے کا جذبہ ابھار کر ہندوستانی خاندان کی اصل روح کو اجاگر کیا ہے۔ برصغیر خاص کر ہندوستان میں اگرچہ بیٹی کا مستقبل اس کی سسرال سے وابستہ ہوتی ہے لیکن پھر بھی اپنے میکے کی خانگی زندگی کے تحفظ کا جذبہ ان کے اندر خاندان کی بہو یہاں تک کہ بیٹے سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اور اس جذبے کی تڑپ شادی کے بعد بھی پوری زندگی اس میں جاگزیں رہتی ہے۔ گنگا جل کی ایثار پسندی اور دردمندی اور خانگی روایات کے تحفظ کا ذریعہ کس طرح نہیں ہے اس کو پریم چند نے اس طرح بیان کیا ہے۔ گنگا جل اپنے باپ سے کہتی ہے۔

> ''بھجن گاتے تو تین دن ہو گئے گھر بار بچانے کی بھی کوئی اپائے سوجھی، سب مٹی میں ملا دو گے، کیا ہم لوگوں کو پیڑ تلے رکھو گے۔ چودھری نے پرغم انداز سے کہا۔ بیٹی مجھے تو کوئی اپائے نہیں سوجھتی۔ بھگوان جو چاہے گا ہوگا۔ بیگ چلو گردھر گوپلا کا ہے بلمپ کرو۔ گنگا جل بولی میں نے ایک اپائے سوچی ہے۔ کہو تو بتاؤں۔ میرے گہنے جھگڑ سا ہو کار کے یہاں گروی رکھو دو۔ میں نے سمجھ لیا ہے۔ دینے بھر کے روپے ہو جائیں گے۔ چودھری نے آہ سرد بھری اور بولے۔ بیٹی تم کو مجھ سے یہ کہتے لاج نہیں آتی، بید شاستر میں مجھے تمہارے گاؤں کے کنوئیں کا پانی بھی نہیں لکھا ہے تمہاری دیوڑھی میں پیر رکھنا بھی منع ہے، کیا مجھے نرک میں دھکیلنا چاہتی ہو۔ گنگا جلی اس جواب کے لیے پہلے سے تیار تھی۔ بولی۔ میں تمہیں اپنے گہنے دیے

تھوڑے ہی دیتی ہوں۔ اس وقت لیکر کام چلاؤ، چیت میں چھڑا دینا۔
چودھری نے زور دیکر کہا۔ یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ برادری میں کس طرح منھ
دیکھاؤں گا۔ گنگا جلی نے چڑ کر کہا۔ برادری میں کون ڈھنڈورہ پیٹنے جائیگا۔
میری بات نہ مانو گے تو تمہارے اوپر میری ہتیا پڑے گی میں آج ہی اس
بیتواندی میں کود پڑوں گی مجھ سے گھر میں آگ لگتے نہ دیکھا جائے گا۔ گنگا
جلی گھر میں گئی اور گہنوں کی پٹاری لے آئی اور انہیں نکال کر چودھری کے
انگوچھے میں باندھ دیا۔''(۱۸)

اس اقتباس کے وسیلے سے پریم چند نے اس دور کی عورتوں میں شعوری بیداری، مردوں میں روایتی وسائل سے بیزاری اور خاندان کے بزرگوں میں بدلتے ہوئے قدروں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی لاچاری اور پرانی روایات کے تحفظ کی احساس ذمہ داری کو اس دور کے تاریخی تناظر میں بیان کیا ہے۔

پریم چند نے دیہی معاشرہ کے کسانی خاندان کی زندگی کو اس کے ماحول کی ساری جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے وہ انسانی فطرت اور خانگی طرز حیات سے خوب واقف تھے اور سماج و خاندان کے بدلتے ہوئے قدروں سے حاصل کردہ تجربات و مشاہدات کو ایک دلکش زبان اور انوکھے فن میں ادا کرنے پر قادر تھے۔

''بانگ سحر'' میں ایک ہی خاندان کے چند افراد کے درمیان معاشی ناہمواری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کشمکش جمعراتی، شبراتی اور خیراتی کے کردار کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے خاندان میں ہر فرد مشترکہ وسائل سے فائدہ اٹھانے کا حق رکھتا تھا ہر معاشرے کے خاندان میں مشترکہ نتائج بنیادی اصول کی حیثیت رکھتے تھے، لیکن نئے دور کی نئی طرز زندگی میں خودغرضی اور انفرادی وسائل نے صرف فرد کی زندگی کو ہی نہیں متاثر کیا بلکہ خاندان کا معیار زندگی بھی متاثر ہونے لگا۔ روایتی خاندان میں ہر شخص یکساں طور پر استفادہ حاصل کرسکتا ہے لیکن جب حصول زر کے وسائل میں تعدد پیدا ہوا تو خاندان مشترکہ ہوتے ہوئے بھی افراد خاندان کی اہمیت و خوشحالی کی یکسانیت مٹنے لگی۔ اس کہانی میں تینوں بھائیوں کی اس زندگی کا ذکر ہے جس میں دو بھائی تو اپنی محنت، لگن اور ہوش مندی کی بدولت خوشحال ہیں۔ لیکن خیراتی اسی خاندان کا حصہ ہونے کے باوجود صرف خاندان کے لیے ہی نہیں بلکہ اپنے بیوی بچوں کے لیے بوجھ اور شرمساری کی علامت ہیں۔

ان کا افسانہ ''سوجان بھگت'' بدلتے ہوئے وقت کے پس منظر میں بوڑھے باپ اور نوجوان بیٹوں کے درمیان تصادم کی مثال ہے۔ بوڑھا باپ جو زندگی بھر گرہستی کی چکی میں پستا رہتا ہے بوڑھا ہونے پر اس کی باگ ڈور بیٹوں کو تھما دیتا ہے۔ اتنا سب کچھ کرنے کے بعد اس کے اندر جب مذہبی جذبات ابھرتے ہیں اور ایک مرتبہ جب وہ ایک فقیر کو بھیک کے اندازے سے زیادہ مقدار میں اناج دیتا ہے۔ تب گھر میں بیٹے اور بیوی سبھی اسے کہنے لگتے ہیں۔

''ہم تو ایک وقت کھا کر گذر اتے ہیں کہ عزت بنی رہے اور تمہیں مٹانے کی سوجھتی ہے۔ تمہیں کیا معلوم گھر میں

کیا ہو رہا ہے'' سوجان بھگت، کو اب معلوم ہو جاتا ہے کہ خاندان میں اس کی حیثیت کیا ہے لہذا پھر سے وہ محنت شروع کر دیتا ہے۔ دراصل پریم چند نے یہاں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ خاندان میں مشترکہ محنت ہی مشترکہ خاندان کی روایات کو استحکام عطا کر سکتا ہے۔ ورنہ اس کے افراد میں ایک بھی اگر دستبردار ہوتا ہے تو وہاں فرد، خاندان اور معیشت کا تانا بانا خود ہی بکھر جاتا ہے۔ موجودہ دور میں خاندان کے بزرگوں کے جو فرائض ہیں اس کی نشاندہی پریم چند اس افسانے کے ذریعہ 1929 میں ہی کر دیتے ہیں۔ آج کے دور میں گھر کے بزرگوں کا بیٹھے رہنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ بچوں کو اسکول لانے لے جانے، گھریلو سامان کی خریداری کرنے اور کسی نہ کسی کام کو کرنے کی ذمہ داری سونپ دی جاتی ہے جبکہ روایتی خاندان میں گھر کے بزرگ کا کام محض حکم صادر کرنے اور فیصلہ سنانے تک ہی محدود تھا۔ پریم چند ترقی یافتہ سوسائٹی کے اس خاندان سے واقف تھے جس میں بزرگوں کی ذمہ داریاں بھی ہوتی تھیں۔ اس افسانے میں اسکی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

روایتی خاندان خاص طور سے دیہی معاشرہ میں وراثت کی ذمہ داری کا مسئلہ حق بندی کے اصول کے تحت چلتا ہے ایک کے ہٹنے پر دوسرا خود اس جگہ کی بھرپائی کرتا ہے۔ بیٹا باپ کی، چھوٹا بھائی بڑے بھائی کی جگہ لیتا ہے۔ اور یہ مشترکہ خاندان کی ایسی روایت تھی جس میں افراد کی انفرادی ترقی کے مواقع محدود ہو جاتے تھے۔ محدود وسائل نسلاً بعد نسل مستقل ہو کر تحفظ پاتے تھے لیکن ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں سوتیلے اور سگے رشتے میں معنویت تھی ایک دوسرے کے تئیں فرض کا احساس تھا۔ پریم چند کا افسانہ علیحدگی اس کی ایک عمدہ مثال پیش کرتا ہے۔ رگھو اس کا مرکزی کردار ہے، جو خاندان کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے پر سوتیلی ماں اور سوتیلے بھائیوں کو اولاد کا درجہ دیتا ہے اور ان کی پرورش میں کوئی کسر نہیں باقی رہنے دیتا ہے۔ لیکن دوسری طرف پریم چند نے بڑے گھر کی بیٹی اور بیٹی کے دھن کی نسوانی کردار کے برعکس ایسے کردار کو پیش کرتے ہیں جو مشترکہ خاندان کی روایات کے لیے خطرہ بن جاتی ہے۔ 'میں' ایک ایسا کردار ہے جو گھر میں گماؤ فرد، رگھو، کی بیوی ہونے کی وجہ سے خاندان کے بٹوارہ اور علیحدگی کی صورت پیدا کر دیتی ہے۔

> ''اب تو جبھی منھ میں پانی ڈالوں گی جب گھر الگ ہو جائے گا بہت جھیل چکی اب نہیں جھیلا جاتا، رگھو سکتہ میں آ گیا۔ ایک منٹ تک تو اس کے منھ سے آواز بھی نہ نکلی، علیحدگی کا اسے کبھی خواب میں بھی خیال نہ آیا تھا۔ اس نے گاؤں میں دو چار خاندانوں کو الگ ہوتے دیکھا تھا۔ وہ خوب جانتا تھا۔ روٹی کے ساتھ لوگوں کے دل بھی الگ ہو جاتے ہیں۔ اپنے ہمیشہ کے لیے غیر ہو جاتے ہیں۔ پھر ان میں وہ ہی ناتا رہ جاتا ہے جو گاؤں کے دوسرے آدمیوں میں۔ رگھو نے دل میں ٹھان لیا تھا کہ اس بلا کو گھر میں قدم نہ رکھنے دوں گا مگر ہونہار کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔

آہ میرے منہ کالکھ لگے گی۔ دنیا یہی کہے کہ باپ کے مرجانے
پر دس سال بھی ایک گھر میں نباہ نہ ہوسکا۔ اور پھر اسی سے الگ ہوجاؤں جن
کو گود میں کھلایا، جن کو بچوں کی طرح پالا، جن کے لیے طرح طرح کی تکلیفیں
اٹھائیں انہیں سے الگ ہوجاؤں، اپنے پیار کو گھر سے نکال باہر کروں اس کی
آنکھیں آبگیر ہوگئیں۔''(۱۹)

بیوی کی ضد پر رگھو کو علیحدہ ہونا پڑتا ہے۔ بنیادی طور پر رگھو مشتر کہ خاندان کے بکھراؤ سے زیادہ سماج کی مریاد تک ہی سوچ رہا تھا، لیکن خاندان کے بکھراؤ کا اندازہ واحساس اس وقت ہوتا ہے جب اسے اکیلے تک ودو کرنی پڑتی، اب وہ سمجھتا ہے کہ کھیتی باڑی اکیلے آدمی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اکیلے کی بھاگ دوڑ سے وہ اس قدر مقہور ہوا کہ بستر مرگ پر جا پڑا۔ پریم چند مشتر کہ خاندان کی روایت اور اس کے محدود وسائل کی سرسبز وشادابی مشتر کہ محنت کے پسینے کو قرار دیتے ہیں۔

اس افسانے میں گاؤں کے اندر خاندان کے بکھراؤ کی بھی صورت گری کرتے ہیں جیسے مذکورہ بالا اقتباس کا یہ جملہ کہ ''اس نے گاؤں میں دو چار خاندانوں کو الگ ہوتے دیکھا تھا'' اس دور کی دیہی معاشرہ کی عکاسی کرتا ہے۔

دیہی معاشرے میں فکر وعمل اور خاندان کا مرکز ومحور زمین ہے۔ اس کے گرد افکار واقدار اور رشتوں ناتوں کی ہیئت تشکیل پاتی رہتی ہے۔ جب کہ زمین کا بٹوارہ اور خاندان سے علیحدگی انہیں رشتوں میں ٹکراؤ پیدا کردیتا ہے۔ افسانہ ،علیحدگی میں گھر اور جائداد تک ہی اختراعی اثر کا نفوذ ہوا تھا، دلوں میں گنجائش باقی تھی اس لیے حالات اور روایت کی گرمی پاکر مشتر کہ خاندان کی بکھری ہوئی کڑیاں پھر سے متحد ہوجاتی ہیں۔ لیکن اس افسانہ میں اس دور کے حالات سے خاندان اور سماج کے درمیان تصادم ایک سوال ضرور قائم کردیتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ جہاں گھر، جائداد، دل اور رشتے سبھی ٹوٹ چکے ہوں وہاں بھی مشتر کہ خاندان کی یہ کڑیاں پھر سے جڑ سکتی ہیں؟۔

ہندوستانی معاشرہ کے خاندان میں، خانہ داری، کی روایت کا چلن بھی عام ہے موجودہ دور میں تو اس میں اور بھی شدت آئی ہے۔ بلکہ خانہ داری کی ایک نئی صورت یہ پیدا ہوتی ہے کہ مرد کے سسرال والے شادی سے پہلے ہی منصوبہ بند طریقے سے یہ حکمت عملی تیار کرتے ہیں کہ بیوی اور داماد جداگانہ طریقے سے انفرادی زندگی گذاریں اور اس کے لیے وہ جہیز کی شکل میں کسی دوسرے شہر یا قصبے میں فلیٹ یا پلاٹ فراہم کرتے ہیں۔ پریم چند کا افسانہ 'خانہ داماد' ایسی ہی صورت حال کی عکاسی کرتا ہے۔ نیز خانہ داماد کی حیثیت اور خودداری مجروح ہوتی ہے تب انسان کی روشن ضمیری حقیقت کی روشنی پاتی ہے اور پھر سے مرد مشتر کہ خاندان کا ہی سہارا لیتا ہے، اس مسئلے کو اجاگر کرکے پریم چند کا آدرش خاندان کے بکھراؤ پر امکانات کو مسترد کردیتے ہیں۔ اس افسانہ میں بھی پریم چند نے زمین کی مقناطیسیت کو دیہی معاشرہ خاندان اور سماج کی زندگی کی بنیادی ضرورت بتایا ہے۔ لیکن ان کا افسانہ 'مالکن' میں زمینی کشش کی قوت کو مجروح ہوتے دکھایا گیا

ہے۔ بیسویں صدی میں نئے زرعی نظام، سیاسی اور معاشی جدت اور بڑی صنعتوں کی استقامت نے زمینی مقناطیسیت اور خاندان وسماج کے لیے خطرے پیدا کر دیے تھے گاؤں کی آبادی کا ایک حصہ نقد مزدوری اور روشن مستقبل کی تلاش میں شہروں کی طرف رخ کرنے لگا تھا جس نے مشترکہ خاندان کی روایت اور سماج ومعاشرے کی تہذیب پر کاری ضرب لگائی تھی، افسانہ مالکن، کا مرکزی کردار رام پیاری شوہر کے مرنے کے بعد مشترکہ خاندان میں رہتی ہے۔ مشترکہ محنت میں منہمک ہو کر دل بہلا لیتی ہے۔ لیکن جب سسر دم توڑ دیتا ہے تو اس کے دیور اور دیورانی نئی زندگی کی تلاش میں شہر کا رخ کر لیتے ہیں۔ رام پیاری گھر کے سناٹوں میں طرح طرح کے نفسیاتی جنسی اور خانگی مسائل سے دوچار ہوتی ہے لیکن وہ اپنے ملازم سے رشتہ جوڑ کر اپنی ضرورت اور خاندان کی روایت کو تقویت پہنچاتی ہے۔ پریم چند مشترکہ خاندان کو پامال ہونے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور اس میں وہ اکثر کامیاب بھی ہو جاتے ہیں کہ اس دور سے ہی نئے سیاسی وصنعتی نظام کی وجہ سے خاندان اور معاشرہ کے درپیش خطرات ابھر رہے تھے، اور دیہی وشہری اختلاط سے سماج و تہذیبی قدریں بدل رہی تھیں، خاندان میں کشمکش پیدا ہو رہی تھی اور مشرق ومغرب کی تہذیبی امتزاج سے ایک نیا سماج ابھر کر سامنے آنے لگا تھا۔

پریم چند کی تخلیقی زندگی کو نظریات کے اعتبار سے مختلف ادوار میں تقریباً ہر نقاد نے منقسم کیا ہے لیکن موضوعات کے اعتبار سے ان کا محور تقریباً ہندوستانی آبادی کی اکثریت کی زندگی یعنی دیہی معاشرہ کے اردگرد ہی گھومتا ہے۔

وہ جس طرح شروع کے افسانوں میں موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں ان کے آخر کے افسانوں میں بھی وہی خاندان، وہی معاشرہ وہی کسان اور زمین، بوڑھے، بچے، عورت اور مرد کی وہی کہانی ہیں مثلاً آخر دور کے افسانوں کا مجموعہ واردات اس دور کے وہی حالات پیش کرتا ہے۔ سوانگ، اسی مجموعہ کا ایک افسانہ ہے جس میں راجپوت خاندانوں کے بدلتے مزاج کو وقت سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ غرض کہ ان کے افسانے تاریخی اور دستاویزی اہمیت کے حامل ہیں ان کے وسیلے سے ملک کی مانگ پیچیدگیوں اور تہذیبی تبدیلیوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ مختلف سماجوں اور معاشروں میں خاندان کی شکل کس نوعیت کی تھی، اس کی اقتصادی اور ترقیاتی شعور کا کیا حال رہا۔ شخصیت کس طرح پارہ ہوئی، پیشے اور خاندانی اصول کے زیر اثر فرد و جماعت پر کس طرح منفی ومثبت اثرات مرتب ہوئے، تہذیب واقدار کے بکھراؤ میں کن کن اسباب وعوامل کی کارفرمائی رہی، علمی اور تکنیکی آگہی نے ذاتی علو پسندی اور جوہری فیملی کو کس طرح فروغ دیا، اور صنعتی ترقی نے خانگی اشتراک کو کس طرح افتراقی کیفیت میں مبتلا کیا یہ ساری روداد پریم چند کے افسانوں میں جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں۔

'بازیافت' میں ایک وکیل کی کہانی ہے، جو مغربی تہذیب میں اس طرح ڈوب جاتا ہے کہ اپنی بیوی کے مذہبی عقائد ورسومات سے وابستگی کی بنیاد پر ذہنی کوفت میں مبتلا ہو جاتا ہے بیوی کی دہقانیت سے گھبرا کر شہر چلا جاتا ہے تاکہ وہاں اس کی بیوی کلب سے جڑے، مغربی تہذیب اپنائے اور روایتی طرز سے بالکل منحرف ہو جائے، لیکن ایک مرتبہ

وکیل صاحب جب بیمار پڑتے ہیں، تب ماضی کی یادیں آنی شروع ہوتی ہیں۔اب کف افسوس ملنے کے سوا کچھ نہیں رہتا ۔اس کو یہ احساس ہو جاتا ہے یہ جسم کی نہیں روح کی بیماری ہے اور روحانی علاج بیوی کے روایتی طریقے میں ہی مضمر ہے لیکن اس کی بیوی بھی اب شہری چکا چوند میں کھو کر بہت دور نکل گئی تھی۔

پریم چند نے تہذیب اور خاندان کی روایات کو مختلف زاویوں سے پیش کیا ہے۔ دیہی معاشرت تو ان کے افسانے میں ملتی ہی ہیں اعلی درجے کی سوسائٹی اور اس کے اچھے و برے اثرات کو بھی موضوع بنایا ہے۔

ان کے بیش تر افسانے متضاد ذہنی کیفیتوں کا احاطہ کرتے ہیں اور قدیم تہذیب کی مسماری کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔ترقی پسند اور رجعت پسند تہذیبی اقدار کے معرکہ کو انہوں نے ایسا پیش کیا ہے کہ ان کے اندر چھپے ہوئے تہذیبی درد کے آثار پھوٹنے لگتے ہیں۔عہد زوال کے تہذیبی منظر ناموں کو بیان کرنا۔

زندگی اور تہذیبی اقدار میں تبدیلیوں کی ایک بڑی وجہ یہ بھی سمجھی جاسکتی ہے کہ کاشت کاروں کی مالی حالت خراب ہوتی گئی اور وہ غیر تعلیم یافتہ بھی تھے مزید یہ کہ خاندان کی وسعت سے ان کی اصل پونجی زمین کے بٹوارے بہت زیادہ ہوتے گئے۔اب یا تو صنعتی پیداوار سے ان لوگوں نے وابستگی اختیار کی یا سیاسی قوت اور تجارتی دقت سے اپنے آپ کو جوڑا یا تعلیمی میدان میں اترے یہ ایسے رجحانات ہیں جس کی وجہ سے نہ صرف ایک ادنی کسان اور ادنی خاندان شہری تہذیب اور طبقۂ اعلی کی طرز زندگی کو اپنانے کی کوشش کرنے لگا اور اپنے اندر اعلی ذاتوں اور اعلی خاندانوں کی تہذیبی اور طرز زندگی کی ہمسری کا جذبہ ابھرا بلکہ توہمات سے انحراف اور فرسودگی سے احتساب کی راہیں بھی کھلیں۔

اس کے نتیجے میں خاندان کی اہمیت گرتی گئی اور انفرادی طور پر نیوکلیائی فیملی کے تحت زندگی گذارنے کے رجحانات پیدا ہوئے۔خاندان میں بٹوارے اور جدا ہونے کی خواہشات نے تہذیبی قدروں کو پامال کیا ترقی پسندی اور رجعت پسندی کے تہذیبی منظر ناموں میں بدلاؤ کا سماں پیدا ہوا۔

''تہذیب کا راز'' میں پریم چند نے ان تہذیبی قدروں کی پامالی کا ذکر کیا ہے کہ ایک انسان جو طاقت وقوت کا حصول تو خاندانی وقار اور روایات کو ترک کر کے کر لیتا ہے، اور بے شمار عیوب کے باوجود مہذب شہریوں میں شمار کیا جاتا ہے، جبکہ وہیں دمڑی کا کردار خانگی وقار کو باقی رکھتے ہوئے ایمانداری کے باوجود، مجرم اور اخلاقیات سے عاری سمجھا جاتا ہے۔زندگی کے بدلتے حالات نے رتن کشور کو خود نمائی اور خود غرضی کے گر سکھا دئے ہیں جن کی وجہ سے مہذب معاشرے اور اس اصول وقانون کے مطابق ہر عیب تہذیب کی آڑ لے کر ہنر اور فن بن جاتا ہے اور فطری سادگی، مخلصانہ وجبری نیکی جرم کہلاتی ہے۔ پریم چند اس کی پیش کش اس طور پر کرتے ہیں۔کہ

تہذیب صرف ہنر کے ساتھ عیب کرنے کا نام ہے آپ برے سے برا کام کریں لیکن اگر آپ اس پر پردہ ڈال سکتے ہیں تو آپ مہذب ہیں، شریف ہیں، جنٹلمین ہیں، اگر آپ میں یہ وصف نہیں تو آپ نا مہذب ہیں، دہقانی ہیں، بدمعاش ہیں، یہی تہذیب کا راز ہے۔ پریم چند نے دو کرداروں کے ذریعہ دو تہذیب کی مرقعہ کشی کر کے اس بات کی

طرف نشاندہی کی ہے کہ یہ صرف شہری اور دیہی تہذیب میں تصادم نہیں بلکہ مغربی اور مشرقی تہذیب کے اثرات کا بھی ہندوستانی معاشرے میں اسی طرح کا عمل رہا ہے۔ مغربی تہذیب سے نابلد ڈمڑی اپنے ضبط نفس، خدمت وایثار، وضع داری اور دردمندی کو اپنائے رہتا ہے۔ اور تہذیب وانسانیت کا یہ درس اس نے کسی ادارے میں حاصل نہیں کیا ہے بلکہ اس کے خانگی نظام کے ممبران جس میں کا ہر بزرگ ایک اتالیق کی حیثیت رکھتا ہے اور جن کا ماحول تہذیبی قدروں کے تحفظ کا سبق دیتا ہے، جبکہ 'رتن کشور' مغربی اثرات سے منفعل ہے جس میں مادی منفعت ہی کو تہذیب کا نقطۂ اعلیٰ تصور کیا ہے، بیٹھے ہزاروں پنشن پاتا ہے اور دیگر مجرمانہ افعال کا ارتکاب بھی کرتا ہے پھر بھی مہذب کہلاتا ہے۔

ان کا افسانہ 'سزا' بھی اسی طرح کی تہذیبی تصادمات کی عکاسی کرتا ہے۔ ایک طرف ڈاکٹر چڈھا جو مہذب پیشوں، اعلیٰ قدروں اور تعلیم وتہذیب کے باوجود انسانیت سے عاری نظر آتا ہے، اور مغربی طرز کی تفریحات کو انسانی قدروں پر ترجیح دیتا ہے تو دوسری طرف بھگت، جو بزرگی کے آخری دن میں قدم رکھ چکا ہے پھر بھی راتوں کے خطرات سے بے پرواہو کر انسانی قدر اور سماجی فرض کو ترجیح دیتا ہے اور اس فرض کی ادائیگی میں نفع ونقصان کا تصور بھی نہیں کرتا۔ اس نے اپنے عمل سے انسانیت کی اس معراج کو پالیا جو سنگ دل انسان کو بھی موم بنا سکتی ہے۔

اگر چہ پریم چند کی مناسبت نے ڈاکٹر کی تقلیب کو بھی اجاگر کیا ہے لیکن تہذیبی قدروں میں تبدیلیوں پر زیادہ زور دیا ہے۔

اسی طرح افسانہ ''توبہ'' میں انہوں نے مغربی تہذیب اور مغرب زدہ ہندوستانی تہذیب کے درمیان تصادم کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ہندوستانی نوجوان کا وہ طبقہ جو انگریزی تعلیم اور مغربی لباس کو اختیار کرتا ہے، اس میں وطنی محبت سے زیادہ اقتدار کی ہوس ہے ملکی روایات اور تہذیبی اقدار سے انحراف بھی ہے۔

اگر چہ پریم چند کی مناسبت نے ڈاکٹر کی تقلیب کو بھی اجاگر کیا ہے لیکن تہذیبی قدروں میں تبدیلیوں پر زیادہ زور دیا ہے۔

اسی طرح افسانہ ''توبہ'' میں انہوں نے مغربی تہذیب اور مغرب زدہ ہندوستانی تہذیب کے درمیان تصادم کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ہندوستانی نوجوان کا وہ طبقہ جو انگریزی تعلیم اور مغربی لباس کو اختیار کرتا ہے، اس میں وطنی محبت سے زیادہ اقتدار کی ہوس ہے ملکی روایات اور تہذیبی اقدار سے انحراف بھی ہے۔

داستان اور قصہ کوئی بھی ہو چونکہ کہانی پر مذہبی رنگ، تسکین قلب کے مواد اور اصلاحی پہلو کی پیش کش پر زیادہ روز دیا جاتا تھا، افسانہ اپنے اولین دور میں بعض مفروضات کو مسخ کر کے نئے تقاضے کو اپنانا شروع کر دیتا ہے لیکن قدیم مذکورہ رنگ سے کلی طور پر انحراف نہیں کرتا مثلاً قدیم داستان جس طرح جدید افسانوں میں تمدنی نقطۂ نظر سے عورتوں اور مردوں کے مسائل، ان کی زبان کا فرق، لباس وزیورات اور کھانے پینے کے ساز وسامان واقعہ کو زمان ومکان اور اس کے ماحولیات سے ہم آہنگی، شادی، بیاہ، رسم ورواج گھریلو اور خانگی طریقۂ زندگی کے نمونے اور اس طرح کی بہت

ساری ایسی چیزیں جو روایتی معلوم ہوتی ہیں لیکن درحقیقت بیسویں صدی کے تمدن کی مٹتی ہوئی نشانیاں ہیں۔ اس لئے ان کے افسانے حقیقی زندگی سے دور ہونے کے باوجود زندگی اور تہذیب کے عمدہ مرقع ہیں۔

پریم چند کا زمانہ سماجی اور تہذیبی اصلاح کی تحریک کا زمانہ تھا بذات خود انہوں نے اصلاحی فنکار کے طور پر اپنے آپ کو ثابت کیا۔ اس کے باوجود ماقبل افسانہ نگاروں کی طرح وعظ گوئی سے محفوظ رہے اور افسانویت و واقعیت کو پروان چڑھاتے رہے شطرنج میں انہوں نے لکھنوی تمدن کی تصویر کشی کی ہے اس میں شاہی دنوں کی مٹتی ہوئی عظمت اور مٹتے ہوئے تمدن کی ذہنیت کی عکاسی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی سماج میں سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور اخلاقی انتشار کی نشاندہی موجود ہے۔ ان کے دوسرے افسانے، وکرمادت، رانی سارندھا، راجہ ہردول، گناہ کا اگنی لکنڈ، ایسے افسانے ہیں جن میں اس نئی تہذیب کو رد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جو تہذیب کی ہر چیز کو خوبصورت بنا کر لوگوں میں کشمکش پیدا کر رہی تھی۔

اس کے علاوہ انہوں نے پرانی تہذیبی روایت کی توہم پرستی کو بھی طنز کا نشانہ بنایا اور اس میں نئی رنگت اور چمک پیدا کر کے مغربی اثرات پر بالکل پردہ ڈالنے میں تو ناکام رہے لیکن اسے نئے سرے سے مشرقی لباس سے مزین کر کے پیش کیا۔ مذکورہ بالا افسانے کا پلاٹ راجپوتوں اور متوسط ہندو طبقہ میں در آئی۔ تہذیبی تبدیلیوں سے مزاحمت اور مفاہمت کی کشمکش سے حاصل کئے ہیں۔

اس قوم پرستی کے جذبہ نے سماجی ابتری کو محسوس کیا۔ اور اس کو بہتر بنانے کے ولولہ نے افسانے میں ایسا انقلاب پیدا کیا کہ وہ سماج جو صدیوں سے اکثریت کے باوجود تہذیبی اور سیاسی اشتراک سے محروم تھا اس کو پڑھے لکھے طبقے سے قریب کیا اور ان کے دکھ درد کے ساتھ ان کی سماجی اور تہذیبی ابتری کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔

پریم چند نے اس سوسائٹی کے احساس شکست کی مصوری کی ہے جس میں وہ خود رہتے تھے وہ ہر جگہ اس ترقی کا حامی دکھائی دیتے ہیں جو بڑھتی ہوئی تاریکی کو روشنی میں بدل دے اور ہندوستان کا ہر فرقہ اس جماعت کا حصہ بن جائے جو ایک قومیت کا مسئلہ میدان میں لیکر آ رہی تھی۔ پریم چند نے مشرقی تہذیب و خاندان کو تخلیقی مداخلت کے ذریعہ ابھارا ہے اور تہذیبی تبدیلی کو حسب سعی مرغوب سمت کی جانب لے جانے کی کوشش کی ہے۔

ہندوستان میں قانون و انصاف کا ایک بڑا دور پنچایت کو تسلیم کیا جاتا تھا اور اسی روایت کے تحت آپسی رنجشیں حل کی جاتی تھیں اور معاملات کو رفع دفع کر کے نہ صرف خارجی تنازعات سے نکال کر لوگوں میں اطمینان رسانی ہوتی تھی بلکہ داخلی طور پر بھی عوام یعنی مدعی اور مدعا علیہ کو سلجھایا جاتا اور رشتے کو ہموار کیا جاتا تھا۔ لیکن حکومتی قانون اور عدالت کی تنظیم نے اگرچہ ہندوستان کو تحریری اور دستاویزی آئین سے آشنا کر دیا ان کی وجہ سے پنچایتی روایت اور اس سے بڑی تہذیب کی وسعت پذیری ہوئی لیکن اس کے برے اثرات بھی نمایاں ہوئے، چنانچہ متعصّبانہ فیصلے ہونے لگے اور غریبوں کو انصاف سے محروم ہونا پڑا۔ دلالوں اور جعلسازوں کی پیداوار میں اضافہ ہوا اور ہر شخص کو بولی لگا کر انصاف

خریدنے کے مواقع عام ہوئے جس میں غریبوں اور اثر ورسوخ نہ رکھنے والے حضرات کی ایمانداری کا گلا گھونٹا جانے لگا۔ان کے افسانے: داروغہ، سزا، بھاڑے کا ٹٹو، نونک جھونک ایسے افسانے ہیں جن میں مذکورہ بالا سماجی اور معاشرتی مسائل کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔

آج اچھے شہری اور تہذیب واخلاق کا حامل انسان کی تعمیر میں دنیا کے ہر حصے میں نئے نئے منصوبے اور حکمت عملی تیار کئے جارہے ہیں۔انسانی قدروں کی تعمیر کے وہ کارنامے جو یہ آسانی اور مالی تصرف کے بعد خانگی زندگی کے تحت انجام پارہے تھے دقتوں اور مختلف نوعیت کے مالی فنڈس کی فراہمی کے باوجود کامیاب نہیں۔پریم چند نے ہندوستانی سماج اور افراد کو ان پرخطر لغزشوں سے تقریباً ایک صدی قبل ہی آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی، ان کو تہذیبی ظاہرداری کے خدشات کا علم اسی دور میں ہو چکا تھا، پریم چند مشرقی روایات کے مثبت اور منفی رویے کو بھی جانتے تھے اور مغرب کی اچھائیوں اور برائیوں سے بھی بخوبی واقف تھے۔لیکن ان کے حساس ذہن نے اس نقطہ کو بھی جاننے کی کوشش کی تھی کہ مشرقی روایات مغربی تہذیب ومعاشرت سے مفاہمت اور تصادمات کی اہلیت رکھتی ہے۔مشرقی تہذیب کا مزاج مغرب کی اچھائیوں ہی سے کلی طور پر ہم آہنگ ہے کہ نہیں۔اور اگر نہیں ہے تو ان اچھائیوں کے اثرات اچھے ہونے کے بجائے منفی بھی ہو سکتے ہیں۔تہذیبی بحران کے نسخے سماج، فرد، دیہی معاشرت، شہری زندگانی کے اصول فطرت سے وابستگی، فوجی اور عدالتی نظام کا استحکام، میانہ کردار، طبقہ اور متوسط زمین دار جماعت، گھریلو اور ازدواجی زندگی، خاندانی روایت اور رشتے وتعلقات کی اہمیت، بچوں کی نفسیات، جوانوں میں بے یقینی اور بوڑھوں کا ذہنی انتشار، مذہب اور عقائد، خلوص اور محبت اور تعلیمی وتربیتی حکمت عملیاں تمام شعبے تغیرات سے دوچار رہے ہیں، کہیں ظاہری طور پر اس کے منفی اثرات کام کررہے ہیں تو کہیں ان کی اچھائیوں میں بھی بے راہ روی کے عناصر کی کارفرمائی جاری ہے۔

اس طرح دنیا میں ہر طرح کے لائحۂ عمل کی تیاری ہورہی ہے اعلیٰ معیار کی حکمت عملیاں بنائی جارہی ہیں لیکن یہ طے کرنا نہایت مشکل ہوگیا ہے کہ تہذیب اور معاشرت کے رویوں کے مثبت اور منفی رویے کی پیائش کا درست آلہ اور پیمانہ کس طرح مقرر کیا جائے اور ہمارے خیال سے یہ ممکن بھی نہیں۔کیوں کہ مغربی تہذیب جس کو ترقی کا آخری نقطہ کہا جاتا ہے ضروری نہیں کہ مشرقی نقطۂ نظر سے درست ہو، یہاں تک کہ مغرب کی جغرافیائی حدود کے ہر حصے میں اس کا مثبت نفاذ کامل اتفاق ہونا ضروری نہیں۔

حواشی

(۱) صغیر افراہیم، اردو فکشن تنقید و تجزیہ۔ص:۲۹۴

(۲) ثریا حسن، انتخاب سجاد حیدر یلدرم، ص:۱۳۱

(۳) ثریا حسن، انتخاب سجاد حیدر یلدرم، ص:۱۳۲

(۴) ثریا حسن، انتخاب سجاد حیدر یلدرم، ص:۱۴۰

(۵) ثریا حسن، انتخاب سجاد حیدر یلدرم، ص:۱۳۶

(۶) ڈاکٹر نجیب اختر، مونوگراف علامہ راشد الخیری، ص:۱۰۲

(۷) ڈاکٹر نجیب اختر، مونوگراف علامہ راشد الخیری، ص:۱۲۹

(۸) علامہ راشد الخیری، ناول افسانے، ص:۲۱۳

(۹) علامہ راشد الخیری، ناول افسانے، ص:۲۱۵

(۱۰) علامہ راشد الخیری، ناول افسانے، ص:۲۱۷

(۱۲) محمد طاہر فاروقی، نمائندہ مختصر افسانے، ص:۲۹

(۱۳) محمد طاہر فاروقی، نمائندہ مختصر افسانے، ص:۳۱

(۱۴) محمد طاہر فاروقی، نمائندہ مختصر افسانے، ص:۳۳

(۱۵) مہناز انور، اردو افسانے کا تنقیدی مطالعہ، ص:۱۵۰

(۱۶) وقار عظیم، نیا افسانہ، ص:۳۳

(۱۷) ڈاکٹر نکہت ریحانہ خان، اردو مختصر افسانے فنی و تکنیکی مطالعہ ص:۲۴

(۱۸) پریم چند، پریم بتیسی، ص:۵۷

(۱۹) پریم چند، خاک پروانہ، ص:۳۵

باب سوم

ترقی پسند افسانوں میں خانگی زندگی کی عکاقی

(الف) روایتی اقدار سے گریز

(ب) ہجرت سے پیدا شدہ بکھراؤ

روایتی اقدار سے گریز

اردو ادب کی تاریخ میں ترقی پسند ادیبوں کی تحریک کا آغاز ایسے زمانے میں ہوا جب ملکی اور غیر ملکی صورت حال سیاسی ،اور معاشی اعتبار سے تغیرات سے دوچار تھے، پہلی عالمی جنگ کی یادیں ابھی باقی ہی تھیں کہ دوسری عالمی جنگ کے خطرات سے عالمی انسانی برادری کے خدشات میں اضافہ ہونے لگا، اور بالآخر اس کی وقوع پذیری نے پوری دنیا کو سخت اقتصادی بحران میں مبتلا کر دیا۔اس صورت حال سے ہندستان کی سیاسی ،سماجی اور ادبی شعور پر شدید اثرات مرتب ہوئے ،ادبی دنیا میں ترقی پسند ادیبوں نے زندگی کی ان زبردست تبدیلیوں کو مختلف اصناف میں برتنا شروع کر دیا ،خاص کر افسانوں کے ذریعے اس عہد کی تصویر کشی میں تخلیق کاروں کی ایک بڑی تعداد ابھر کر سامنے آئی۔ان کی تخلیقات میں روایتی اقدار سے گریز اور سماجی و خانگی زندگی میں نئی قدروں کی آمد کے تذکرے کس طرح ہوئے اس کے تجزیئے سے پہلے اس دور کے حالات پر تھوڑی روشنی ڈالنا مناسب ہوگا۔

بیسویں صدی کے اس عہد میں سیاسی بیداری کا اندازہ اس دور کے مختلف تحریکات سے لگایا جا سکتا ہے۔ 1914 میں جرمن اور برطانیہ کے درمیان جنگ شروع ہوئی، ہندوستانی فوج کی اس میں شرکت ہوئی اس کا سبب جہاں ایک طرف جذبہ آزادی کی بقا تھی تو دوسری طرف سیاسی بیداری کے محرکات کی بھی کارفرمائی تھی۔دلوں میں یہ خواہش کہ اس کے بعد ہندستان آزاد کر دیا جائے گا، محض ایک گمان تھا، مگر آزادی کی لہر روز بروز تیز ہو رہی تھی اس میں عدم کامیابی کا نتیجہ تھا کہ 1919 میں ستیہ گرہ تحریک ملک گیر پیمانے پر کامیاب ہوئی۔1920 میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس ہوا اور ہندوستانیوں نے حقوق کے حصول کی لڑائی میں کامیابی پائی نظام حکومت میں بھی تبدیلیاں ہوئیں۔1937 میں کانگریس نے اکثریت والے صوبوں میں اپنی وزارتیں بنائیں اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اس طرح حکومت میں مداخلت کا بڑا موقع فراہم ہوا اور اس کے تحت تعلیم ، دیہات، گھریلو صنعت اور دیگر امور میں ترقی کے لئے اہم اقدامات کئے گئے لیکن اس کے باوجود انگریزی حکومت اپنے اختیارات کو غیر قانونی طور پر استعمال کرنے سے گریز نہیں کی اور دوسری جنگ عظیم میں ہندوستان کی شراکت کا اعلان اپنی مرضی سے کر دیا ہندوستانی رہنما انگریزوں کی اس حرکت سے نالاں تھے بایں وجہ ہندوستان کی آزادی، اور فوجی انتظام میں خود مختاری کی مانگ کرنے لگے، یہ مطالبہ پورا نہ ہونے پر

یہ آواز احتجاجی صورت اختیار کر لی اور ہندوستان چھوڑو تحریک کے طور پر 1942 میں ابھر کر سامنے آئی۔

اردو کی ادبی تاریخ میں بیسویں صدی کے نصف اول کے حالات و کوائف بھی کچھ ایسے ہی تھے جن پر نہ صرف ملکی تغیرات کا دباؤ تھا بلکہ غیر ملکی یعنی پہلی عالمی جنگ میں جاپان کی شکست اور دیگر ممالک میں تہذیبی تحفظ کی بیداری کا تاثر بھی ان پر قائم ہو رہا تھا۔ ملک میں متوسط طبقے کی شعوری بیداری میں بھی پختگی آ گئی تھی۔ اسی طبقے کے کچھ افراد نے فن و ادب کے ساتھ زندگی کے تعلق کو قریب تر اور گہرا کرنے کے لئے ایک منظم اور منضبط اصول کو ادبی دنیا سے روشناس کرایا۔ اور اس کے تحت مختلف زبان کے فنکاروں اور تخلیق کاروں کو یہ باور کرایا گیا کہ ادب چاہے جس طرح کے بھی ہوں محتاج حیات ہیں، زندگی ہی انہیں توانائی و تازگی، رنگ و آہنگ اور حسن و خوبصورتی عطا کرتی ہے۔ اور ارتقائے شعور پر ہی ارتقائے ادب کا انحصار ہے اس تحریک کے زیر اثر اردو افسانہ کے موضوعات میں تنوع اور نیا پن آیا، سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف ایک مخصوص فضا پیدا ہو گئی۔

اس باب میں ترقی پسند افسانہ نگاروں کے تخلیقات میں خانگی زندگی اور سماج کے بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ لینا اور نئے اقدار کے عبوری اور ترقیاتی روش کی پیمائش کرنا موضوع خاص کے تحت آتا ہے لیکن ان کے افسانوں میں ان تغیراتی اور ترقیاتی قدروں کی نشاندہی سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ ذکر کیا جائے کہ ہندوستان اس وقت کن کن مراحل کو طے کر چکا تھا اور کن نئے امکانات کی حصولیابی کی طرف گامزن تھا نیز سماج و معاشرے اور خاندان و تہذیب کی روایتوں کے تعلق سے بکھراؤ اور شیرازہ بندی کے سلسلے کس نوعیت کے جاری تھے۔

اس بات میں دو ذیلی ابواب ہیں ایک نئی قدروں کا ظہور اور دوسرا ہجرت سے پیدا شدہ بکھراؤ کے تجزیے پر مشتمل ہے ان دونوں ذیلی ابواب میں تسلسل قائم رکھنا کافی دشوار کن مسئلہ ہے کیوں کہ یہاں 'قبل' اور 'مابعد' کے درمیان تقسیم ہند کا واقعہ ملکی و ادبی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بہر حال ان ابواب کے تحت افسانوی تاریخ کے جس عہد کا احاطہ مقصود ہے اس عہد کا پس منظر بھی بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ہندوستانی سماج کی ایک بڑی خوبی تہذیبی اشتراک ہے اس میں کئی مذاہب کے پیروکار اپنے اپنے عقائد و نظریات اور تہذیبی اختلاف کے حامل ہیں۔ اس کے باوجود ان میں آپسی میل جول، ایک دوسرے کی غم خواری اور شراکت داری کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ لیکن انگریزی فریب کاری نے ان پر غلبہ پا کر آپسی تناؤ کی ایسی صورت پیدا کر دیا کہ ہندوستانی عوام غیر شعوری اور شعوری طور پر سماج کے اس ڈھانچے کو مجروح کرنے پر آمادہ ہوئے، اس کے پس پردہ کون سی قوت کام رہی تھی اس کا علم ہندوستانی عوام کو تھا بھی اور نہیں بھی۔ لیکن ان میں فاصلے روز بروز بڑھتے رہے۔ وحدت قومی کا جذبہ دن بہ دن کمزور ہوتا گیا اور سماج کی صورت ان تبدیلیوں سے مسخ ہوتی گئی۔ ہندو مسلم کے درمیان،

ذاتی منافرت نے نہ صرف سماج اور خاندان کے نظام کو تہہ و بالا کیا نہ محض انفرادی اور اجتماعی حیثیت کو بیکار کیا بلکہ اس کی لہر اتنی تیز ہوئی کہ ملک تقسیم ہو کر رہ گیا۔ کرشن چندر نے ان اثرات سے جو اخلاقی اور سماجی قدروں کی پامالی ہوئی اس کا غیر جانبدارانہ طریقہ سے جائزہ لیا ہے اور سماجی اقدار سے انحراف و گریز کے مسائل کو اجاگر کیا ہے۔

ہندوستان میں ہمیشہ سے خاندان کو ایک عظیم ادارہ تصور کیا گیا ہے، سماجی اکائی کے طور پر زندگی کے ہر پہلو کے فروغ میں خاندان اور کنبے کا اہم کردار رہا ہے خاندان ایک تربیتی ادارہ ہے مالی تحفظ اور باہمی امداد کا تصور اس سے وابستہ رہا ہے، جانی اور دیگر مصائب میں سیکورٹی سسٹم کی پالیسی کی کمیٹی کے طور پر بھی اس کے کارنامے ہیں۔ اقتصادی تعاون اور سماج کے حفاظتی انتظام کی حکمت خاندان کا اہم وصف رہا ہے۔

ہر خاندان علاقائی، مذہبی اور پیشہ ورانہ طور پر اپنی تہذیب کا حامل تھا اور اسی سے اس کی شناخت بھی قائم تھی لیکن نوآبادیاتی حکومت نے جہاں تعمیری قوتوں کو ابھارا، عوام کی معیار زندگی کو بڑھایا، تعلیم، تہذیب اور تمدن کو آزادی کے ساتھ حاصل کرنے کا موقع دیا، تہذیبی نشو ونما میں مدد کیا وہیں استحصال انگیزی اور جابرانہ پالیسی کے ذریعہ تخریب کاری کی تمام حرکتیں بھی انجام دیئے۔

برطانوی حکومت میں قانون آراضی کے نئے نظام کے قیام سے نجی ملکیت کا تصور عام ہوا جس کے نتیجے میں دیہی اور شہری سماج میں کئی طبقے ابھر کر سامنے آئے، خاص کر صنعت کاری کو ہندوستان میں انگریزوں نے جب فروغ دیا تو اس کی وجہ سے برژوا سوسائٹی پہلی بار ہندوستان میں پروان چڑھی اور اس کے ساتھ ساتھ صنعتی مزدور کا بھی وجود ہوا اور پرولتاری کمیونٹی قائم ہوئی۔ اسی درمیان نئے تعلیمی نظام نے ہندوستان میں متوسط طبقے کو جنم دیا۔ یہ سارے ایسے اسباب و محرکات ہیں جن سے ہندوستان کی نئی نسلوں میں برطانوی طرز زندگی، طرز عمل اور طرز رہائش کی رغبت پیدا ہوئی اور دھیرے دھیرے سماج و خاندان میں بھی جدید طور طریقے در آتے گئے۔

اس دور کے تحریکات و تنظیمات سے عوامی وابستگی نے بھی ہندستانی سماج و خاندان میں تبدیلیوں کی حرکت پذیری کو رفتار فراہم کیا۔ حکومتی پالیسیوں سے ہندوستانیوں کو نظر انداز کیا جانا سیاسی اور قانونی بیداری کا باعث بنا اور مختلف تحریکات و تنظیمات قائم ہوئے یہاں تک کہ سیاسی پارٹیوں کو بھی استحکام کی صورت انہیں استحصالی زور کے مقابلے میں نکھر کر سامنے آئی۔ اس کے بعد ملکی پارٹیوں میں اختلاف رونما ہوئے چاہے اس کی وجہ کچھ بھی ہو لیکن انگریزوں نے بھی در پردہ سازشوں کے جال بچھائے اور آخر کار ہندوستانی حکومت سے دستبرداری کا انتقام ملک کو تقسیم کرا کر لیا۔ تقسیم ملک سے قبل انگریزوں نے اپنی منافرانہ پالیسی سے ہندوستان میں مذہبی اور طبقاتی منافرت کو اس طرح پھیلایا کہ اس میں چنگاریوں کی صورت بھی نہیں پیدا ہوئی کہ اس کا قلع قمع کرنے کی تجویز کی جائے۔ اس میں شعلہ جوالہ پھوٹ پڑا اور فسادات کی لہر میں ہر چہار جانب کشت وخوں کے بازار گرم ہونے لگے، اس اجمالی بیان کے تناظر میں ہندوستان کی سماجی اور خاندانی زندگی کی صورت حال کو دیکھا جائے اور اس کی تہذیبی و روایتی قدروں کا جائزہ لیا جائے تو یہ امر پوری

طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ وہ خاندان جس کا معاشی انحصار پوری طرح گھریلو کارخانداری نظام کے تحت قائم تھا۔ ہجرت کے سبب مٹ گیا، وہ رشتے داریاں اور قرابتداریاں جو کئی نسلوں پر مشتمل تھیں تقسیم اور فساد کے سبب منتشر ہو گئیں، صنعتی ترقی نے اس پر کاری ضرب لگائی کہ مختلف میدان کے دستکاروں کو صنعتی مزدور یا کسانی مزدور بننے پر مجبور کر دیا۔ وہ خاندان جو کاشتکاری کے پیشے سے جڑے رہے ان کی خانگی زندگی میں روایتی اقدار تو کچھ حد تک برقرار رہی اگر چہ وہ بھی مہاجنی سسٹم کے استحصال سے مغلوب تھے اور ان میں بھی شہروں کی طرف منتقلی شروع ہو رہی مگر ان کی رفتار ہنوز کافی دھیمی تھی جب کہ صنعتی مزدوروں کی شہروں میں منتقلی کی وجہ سے خانگی زندگی اور تہذیبی اقدار میں تبدیلیوں کا سلسلہ پھوٹ پڑا وہ نہ صرف خود کو شہروں سے منسلک کیا بلکہ اولاد اور بیوی کی بھی ان کو ضرورت محسوس ہوئی۔ جس سے نیوکلیئر فیملی کا رجحان زور پکڑنے لگا یہاں ان کی ثقافتی شناخت متعدد ثقافتی رنگوں میں مدغم ہونے لگی اور اس کے امتزاج سے ایک نئی تہذیب وجود میں آنے لگا۔ اس طرح کاروباری سلسلہ کے پہلوؤں میں لوگ بے جھجک شہروں کی طرف سفر کرتے رہے اور نئی جگہوں پر پرانے رشتوں، خاندانی روایتوں اور تہذیبی و سماجی رنگتوں کو خیر آباد کر کے نئے رشتوں اور نئی ثقافتوں سے رشتہ قائم کرتے رہے۔ ان رشتوں میں اقدار اور جذبہ کی کمزوری پیدا ہونے لگی۔ ایمانداری، محبت، پیار، عزت، روحانیت، اخوت و مساوات اور انسانیت کی قدریں متزلزل ہونے لگیں۔ جدیدیت کے تصور نے اجتماعی زندگی گزارنے کے طریقے کار کو تنہائی میں مبتلا کر دیا۔ موجودہ عہد کے تقابل میں اس دور میں بے راہ روایانہ روشن اس قدر انسانیت سوز نہیں تھی۔ لوگ رشتہ داروں سے علیحدہ ضرور ہوتے مگر ان میں اس کی سوزش باقی تھی۔ جذباتی وابستگی بھی پوری طرح مفقود نہیں ہوئی تھی یعنی اخلاقی قدروں کے خیالات موجود تھے اگر چہ سماجی تبدیلیوں میں حرکت پذیری کی رفتار تیز تھی مثلاً شادی بیاہ کے معاملات میں بہت ساری بندشیں ٹوٹ رہی تھیں دولہا اور دلہن کے مابین مذہبی، علاقائی وسعت کی وجہ سے فکری تنوع پیدا ہو رہی تھی، ایک طرف تعلیمی بیداری اور سائنسی و تکنیکی شعور بلند ہو رہے تھے تو دوسری طرف اس کے نتیجے میں طلاق، جہیز، جنسی روابط، ازدواجی زندگی کے تنازع اور گھریلو خانگی جھگڑے کی شرح میں اضافے ہو رہے تھے۔ پسند و ناپسند کے مرحلے انفرادی مداخلت سے سر کر لئے جا رہے تھے۔

یہ باب بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے آزادی کے بعد تک کے ان سماجی حالات اور خاندان کی تبدیلیوں پر محیط ہے جو اردو افسانے کے اہم موضوعات رہے ہیں۔ اس عہد میں سماج اور معاشرے کی پرانی روایات اور قدیم ادارے کے تئیں بے زاری اور صنعتی دور کی خوشحال زندگی اور آزاد خواہشوں کی طرف غالب رجحان، خاندان کے بکھراؤ، طبقہ نسواں کے مساوی حقوق کے مطالبات، پس ماندہ طبقوں میں بیداری اور مزدور طبقے کی تنظیم کاری، متوسط طبقہ کی فعالیت، نئے سماجی رشتے و نئی کشمکش اور اس کے ساتھ ساتھ ہجرت اور فسادات کے مسائل بڑی تیزی سے پروان چڑھ رہے تھے اس کے نتیجے میں خانگی زندگی کی صورت شکست و ریخت اور اتھل پتھل کی کیفیت سے دوچار تھی۔ خانگی زندگی کا مطالعہ اگر اس عہد کے سماجی رویے کے تناظر میں کیا جائے تو بہت سارے ایسے مسائل ابھر کر سامنے آتے ہیں جو

قدیم ہندوستانی سماج کی عناصر ترکیبی میں انتشار کے اہم عوامل تصور کئے جا سکتے ہیں۔ ہندستان کی وہ سماج جس میں عوامی زندگی کسی خاص گروپ، فرقہ اور مذہب سے منسلک ہوتے ہوئے بھی ایک قومی سماج کی حیثیت رکھتی تھی۔ رسم ورواج کی فرسودگی اور توہم پرستی و جہالت کے باوجود خاندانوں کا ایک ایسا عمدہ نظام تھا جس کے تحت تین چار نسلیں اتحاد واتفاق سے رہتی تھیں ہر فرد کو زندگی گزارنے کے بہترین مواقع میسر تھے۔ باہمی امداد کا جذبہ سبھوں میں یکساں طور پر معجزن رہتا تھا۔ خاندان، نظم وضبط کا ایسا نمونہ تھا کہ ابتدائی تربیت کے مسائل خود بخود حل ہو جاتے تھے تمام افراد، گھر کے بزرگ اور خاص فرد کے علاوہ ہر فرد ایک دوسرے کے لئے آدرش کی حیثیت رکھتا تھا۔ خلوص ومحبت، ایثار وقربانی اور صلہ رحمی کے عناصر یکساں طور پر سب کے دلوں میں گھر کئے ہوئے تھے۔

ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں کے مقاصد کے تعلق سے بات کی جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سماجی اور تہذیبی تحفظات کا جذبہ ان میں شدت سے کارفرما رہا ہے۔ انسانی زندگی کے عروج کے قائل رہے ہیں۔ عوام کی بہتری اور روایت کی برقراری کا عزم ہمیشہ ان میں موجود رہا ہے۔ چنانچہ بشمول پریم چند اس دور کے اردو کے افسانہ نگاروں نے سماج اور خاندان کے انتشار کی شیرازہ بندی کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ کرشن چندر حقیقت اور رومان کے امتزاج سے جہاں روایت کی فرسودگی کو بیان کر رہے ہیں وہیں مشرقی سماج وتہذیب کی خانگی روایت کے صالح قدروں کا بھی ذکر کر رہے ہیں۔ بیدی پنجاب کے گھریلو زندگی کے مسائل کے ساتھ ساتھ پورے ہندوستان کی بدلتی قدروں کو بے باکانہ انداز میں پیش کرتے نظر آتے ہیں، عصمت جو خود کی زندگی میں ہر موڑ پر اپنے آپ کو زنجیر شکن کے طور پر پیش کر رہی تھی۔ ادبی دنیا میں آکر سماج، تہذیب اور خاندان کے ساتھ ساتھ عورتوں کی مقید زندگی اور پھر اس کے بعد ان میں عصری بیداری کی آڑ میں تہذیبی و روایتی اقدار سے گریز کے نمونے پیش کر رہی ہیں اور ان کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ نئی نسلوں میں انحراف کے جذبات کا شدت سے ابھرنے میں کو صرف ان کا قصور نہیں بلکہ سماج کے نظام اور بزرگوں کی شدت پسندی پر بھی محمول کرتی ہیں اور دیہاتی زندگی کے ساتھ ساتھ شہری زندگی اور کنبے کے حالات اپنے افسانوں میں پیش کرتی ہیں، اختر اورینوی نے بھی وقت اور موضوع کی مناسبت سے حسن کو ہر رنگ میں دیکھنے کی کوشش کی ہے زندگی کو ہر پہلو اور حیات کو ہر زاویے اور ہر سطح سے دیکھا اور دکھایا۔ سماج، گھر، خاندان، فطرت، سیاست، معیشت اور روزمرہ خانگی زندگی ان کے بہت سارے افسانوں میں الگ الگ اور بعض افسانوں میں یکجا مل جاتے ہیں، قرۃ العین حیدر بھی ایک واضح انداز نظر کی مالک ہیں ان کا یہ انداز نظر زندگی کے ہر رخ اور اس کی تاریخ کے ہر گوشے میں ایک سراغ پا لیتی ہے۔ وہ موضوع کو وسیع پس منظر میں دیکھتی ہیں اور ملکی تہذیب کے زوال اور اس کے اثرات کا جائزہ سیاسی، سماجی، تاریخی، نفسیاتی ومعاشرتی نقطۂ نظر سے کرتی ہیں۔ ان کو تہذیبی تبدیلیوں کا کوئی گلہ نہیں۔ طبقہ انسان کی پستی اور ترقی سے بھی کوئی شکوہ نہیں۔ وہ ہر حقیقت کی مسلسل تبدیلیوں کو فطری قانون پر مبنی تصور کرتی ہیں۔ مگر اس کے سمت کو درستگی کی طرف گامزن دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ عالمی سطح پر تہذیبی اور روایتی تحفظ کی مثال پیش کر کے

ہندوستانی سماج ومعاشرہ کی تبدیلی میں تیزی اور حریصانہ جذباتی انداز نظر سے مضطرب ہوتی اٹھتی ہیں۔ وہ یہ خیال کرتی ہیں کہ صنعتی دور میں جب کہ علم و ہنر اور ذہنی بیداری پھیل رہی ہے پرانے نظام اور امریت کا تصور کا قائم رہنا کسی بھی طرح بہتر نہیں۔ لیکن قدیم روایت کی پائداری کے اقدامات لازمی امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تاریخی مواد سے زیادہ کام لیتی ہیں۔ کسی بھی تاریخ کی سحر کاری سے اس قدر مغلوب ہوجاتی ہیں کہ صفحات کے صفحات علاقے، تہذیب، سماجی نظام اور خاندان کے ہر پہلو کی طرز رہائش کے بیان سے پر نظر آتے ہیں۔ سہیل عظیم آبادی نے افسانوں کے ذریعہ اپنے عہد کے سماج، اپنے علاقے کے خاندان اور کنبہ اور اپنے ملک کی تہذیبی و روایتی قدروں کے نشیب و فراز کو فنکارانہ مہارت سے پیش کیا ہے، خواجہ احمد عباس کے افسانوں میں ہندستانی سماج ومعاشرے کے ہر طبقے اور خاندان کی بدلتی ہوئی تہذیبی قدروں پر مبنی موضوعات ملتے ہیں، انہوں نے گھریلو و خانگی زندگی میں صنعتی و تعلیمی ماحول کے ابھرتے ہوئے نقوش کو اپنے تخلیقات میں اجاگر کیا ہے۔

کرشن چندر اردو افسانہ نگاری میں اس وقت اپنے تخلیقی جواہر پارے کو پیش کرتے ہیں جب ہندوستان میں تبدیلیوں کا دور پورے عروج پر تھا۔ انگریزوں کے خلاف نفرت کی لہر تیز ہورہی تھی۔ عوامی بیداری میں شدت پیدا ہو رہی تھی۔ روسی انقلاب کے نتیجے نے دنیا کے ہر خطے کو متحیر کردیا تھا اور دانشوروں کو ذہنی وفکری کشمکش میں مبتلا کردیا تھا۔ دوسری طرف سائنسی ترقی کی حیرت انگیزیاں اور انگریزی حکومت کے زیر اثر عیسائی مشینریز کی تبلیغی کارفرمائیاں ہندوستان کی مذہبی اور تہذیبی قدروں پر حاوی ہورہے تھے اور مغربی اقدار کی مداخلت شروع ہورہی تھی، اس کے نتیجے میں ہندوستانی عقائد اور قدیم اصنام پرستی کی جڑیں کھوکھلی ہورہی تھیں۔ اس کے کچھ مثبت پہلو بھی تھے وہ یہ کہ لوگوں میں اچھی اور بری قدروں کے امتیازی شعور بلند ہورہے تھے۔ یہ ایسا زمانہ تھا جس میں مذہبی روایات اور کہنہ قدروں کے تئیں ترک واختیار کی کشمکش تیزی سے رونما ہونے لگی تھی، انسانی اعتماد فرسودہ روایت کے تعلق سے متزلزل ہورہا تھا اور ایک نئے سماجی ڈھانچہ کی تشکیل ہورہی تھی، کرشن چندر نے ادب کے وسیلے سے ان تمام مسائل کے اظہار کے لئے ترقی پسند تحریک سے اپنے آپ کو وابستہ کیا اور اس کے اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے روایتی اقدار سے گریز اور زندگی کی پیچیدگیوں کو اپنے افسانوں میں برتنے کی کوشش کی۔ ہندوستانی تہذیب اور مغرب کی تقلید پرستی کے جذبات سے ابھرنے والے شخصی اور اجتماعی زوال سے انہوں نے اپنے افسانے کو ہم آہنگ کیا ہے۔ ان کے افسانوں کے ذریعہ اس عہد کے ہندوستانی سماج کی بدلتی ہوئی خانگی زندگی کی جھلکیاں بخوبی نمایاں ہوتی ہیں۔

کرشن چندر نے ملک کے سماجی حالات اور ملک میں ہونے والے واقعات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ اس کے علاوہ روایتی اقدار سے گریز اور خانگی واز ودواجی زندگی میں پیدا ہونے والی کش مکش پر بھی انھوں نے بہت سارے افسانے لکھے۔ خاص کر شادی کے بعد کی گھریلو زندگی جس میں شوہر اور بیوی کی محبت تنازع، اور ملازمت کے رجحان پیدا ہونے والے شکوک وشبہات اور اس کے نتیجے میں مشترکہ خاندان کے ٹوٹنے اور بکھرنے کی صورتیں ان

کی تحریروں میں جا بجا ملتی ہیں۔ وہ جہاں دیہات کے کسانوں کی زندگی اور ان کی طرز رہائش کو بیان کرتے ہیں، وہیں شہری زندگی کی عکاسی بھی۔ فٹ پاتھ کی زندگی، غریبوں کی جھگی اور جھونپڑی، ملوں اور کارخانوں سے وابستہ مزدوروں کے قحط زدہ ماحول یہ سب بھی موضوعات افسانوں میں برتے گئے ہیں۔ کچرا بابا، پانچ روپے کی آزادی، مہالکشمی کا پل، فٹ پاتھ، سو روپے، ایرانی پلاؤ ان کے ایسے افسانے ہیں، جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان کے سبھی کردار ایسے ہیں، جو کسی نہ کسی مشترکہ خاندانی نظام سے وابستہ تو تھے، لیکن صنعتی ترقی اور زمین کے نئے اصول نے انھیں کارخانوں اور شہروں کی سب سے نچلی سطح کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب ان کے پاس آمدنی کم اور خاندان بڑے ہیں۔ بعض کردار تو بالکل شہری زندگی کی آلائشوں میں مبتلا ہیں، جب کہ بعض کردار کی دیہی وابستگی کسی نہ کسی طرح قائم ہے۔ لیکن تمام کے حالات مشترک ہیں۔

ان کے افسانہ گرجن کی ایک شام میں روایتی اقدار سے گریز اور خانگی زندگی کے تلازمات میں تبدیلیوں سے پیدا ہونے والی کشمکش پائی جاتی ہے۔ کرشن چندر نے ان کو اس طرح بیان کیا ہے۔

> ''اس دودھ کو پی لر نیند بہت آتی ہے۔ ساری زندگی ایک سپنہ معلوم ہوتی ہے۔ دراصل گرجن ہے بھی ایک سپنا۔ ورنہ ایسے مقام تو اب ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ اب تو دنیا تلخ حقیقتوں سے بھری جا رہی ہے۔ نقلی دودھ اور نقلی محبت اور نقلی انسانیت اور پھر زندگی کارخانے سے گھر کے گندے صحن میں اور گندے صحن سے کارخانے کے گندے ورکشاپ تک محدود رہتی ہے۔ اس زندگی میں بچے پیدا ہوتے ہی بوڑھوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہیں۔''(۱)

کرشن چندر کا افسانہ شہزادہ رومانی اور حقیقت نگاری کے پیرایے میں خاندان اور معاشرے میں جنم لے رہی جنم کی برائیوں شادی کے نئے طور طریقوں اور عورت کی نفسیاتی پیچیدگیوں کا عمدہ اظہار ہے۔ اس کی کہانی یہ ہے کہ جیون رام کا خاندان مالی اعتبار سے کمزور ہے، لیکن اس نے اپنی اولاد کو تعلیم دیا ہے۔ اس کی بیٹی سدھا، اس کہانی کا مرکزی کردار ہے۔ وہ ہمیشہ گم صم رہتی ہے۔ ایک مرتبہ اس کے باپ نے اس کی شادی کے لیے اسکوٹر جہیز کی نقدی اور سونے چاندی کے بہت سارے گہنے اکٹھا کر کے ایک لڑکے کو اسے دیکھنے کے لیے بلاتا ہے۔ لیکن لڑکے کو اس کی سادگی پسند نہیں آتی۔ وہ انکار کر جاتا ہے۔ دوسری طرف سدھا اسکے عشق میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اور وہ اس کے بعد شادی کے ہر رشتے سے انکار کر دیتی ہے۔ اسی درمیان اس کے والدین اس دنیا سیر خت سفر باندھ لیتے ہیں اور اس کے بھائی بھی اپنی اپنی ملازمت کے ٹھکانے پکڑ لیتے ہیں۔ دوسری طرف موتی سدھا سے انکار کے بعد کسی دوسری لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ بڑے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے، موتی اس سے ازدواجی زندگی ہموار کرنے میں ناکام رہتا ہے، اس

طرح اس میں جیون رام کے خاندان کی انتشار اور سدھا کے نئی طرز زیست کی طرف بڑھتے رجحان کے ساتھ ساتھ موتی کی ازدواجی زندگی میں بڑھتی کشمکش کے تناظر میں اس دور کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔

کرشن چندر نے جدید تعلیم، مغربی تہذیب اور عورت کی خود کفالتی کے جذبے کے زیر اثر وجود میں آنے والے ان ازدواجی رشتوں اور خانگی ضابطوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے جن میں روایتی اقدار سے گریز اور مشترکہ خاندانی رشتوں سے الگ زندگی گذارنے کا رجحان گہرا ہو رہا تھا۔

عصمت چغتائی نے دیہی معاشرے، شہری سماج، خانگی نظام حیات اور گھریلو روزمرہ زندگی کے حالات کے پس منظر کو اپنے اکثر افسانوں میں بیان کیا ہے۔ عورت کی تحفظ و کفالت کے اعتبار سے کمزوری، ترقی پذیر سماج اور افراد کی جدوجہد، ان کی ذہنی و جذباتی کیفیات اور انفرادی و اجتماعی زندگی سے تعلق رکھنے والے مختلف عناصر کی تفہیم و تجزیئے، ان کے افسانوں میں شامل ہیں۔ اس میں شک نہیں کی عصمت کے افسانوں اور ان کی فکر و فن پر بڑی حد تک اختلافات وطنز کی مہر لگی ہوئی ہے لیکن یہ ان کے فکر و فن کا عیب نہیں اور نہ ہی موضوعات کی خرابی ہے بلکہ عمیق انسانی زندگی کے مطالعہ اور سماجی شعور کا نتیجہ ہے۔

برطانوی دور حکومت کے آخری ایام میں تحریک آزادی ایک قومی قدر مشترک تھی جس سے نہ صرف بین طبقاتی یا سماجی مشترکہ رشتے قوی ہوئے تھے بلکہ اظہار ذات اور بلند پروازی خیال کے تمام سرو تے اسی چشمہ میں مدغم ہو گئے تھے۔ وہ چاہے عشق و محبت کے معاملات ہوں یا جذباتی و اضطرابی پیچیدگیاں، فرسودہ رسم و رواج، نئی تہذیبی قدروں کی تلاش اور سماجی و خانگی نظام میں نشاۃ ثانیہ کی خواہش ہو یا مغرب کے تصورات، نظریات، جاگیردارانہ استبداد ہو یا متوسط طبقے کی حرکت و رفتار، ترقی پسندانہ خیالات کے مباحث ہوں یا روایتی اقدار سے گریز کی کشمکش یہ ساری چیزیں کسی نہ کسی سطح پر زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کر رہی تھیں، عصمت کی فنکارانے صلاحیت بھی ان تبدیلیوں سے بے حد متاثر ہوئی، وہ اپنے ہم عصروں میں اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ ان کے افسانوں میں تہذیبی، سماجی اور معاشرتی موضوعات کا دائرے گھریلو زندگی اور عورتوں کے مکمل نفسیات تک پھیلے ہوئے ہیں جس کے پس منظر میں خاندان اور سماجی طبقات کے نظم وضبط اور ہیئت و ساخت کے بننے اور بکھرنے کے عمدہ نمونے موجود ہیں۔

ان کے افسانے بچھو پھوپھی، بہو بیٹیاں، بھابھی، جوانی، دو ہاتھ، شادی کنواری، کیسی بیوی کیسا شوہر، گنگا بہتی ہے اور نئی دلہن وغیرہ ایسے ہیں جن کے موضوعات ہندوستان کی خانگی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان میں قدیم اور جدید نظام خاندان کے تصادمات کو اجاگر کیا ہے۔ خاص کر عورتوں کی تعلیمی بیداری کے نتیجے میں رونما ہونے والے نئے مسائل، طلاق، خلع، بے حجابی، فیشن زدگی، نئے پیشے و نئی ملازمتوں سے وابستگی اور شہری تہذیب کو اپنانے کے مسئلے کو انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے بیان کیا ہے۔

''بہو بیٹیاں'' اس افسانہ میں ایسا موضوع پیش کیا گیا ہے جس کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عصمت کی

رسائی خاص کر مسلم متوسط طبقے کی خانگی زندگی کی باطنی سطح تک گہری ہے۔ وہ اس ماحول میں پروان چڑھنے والی زندگی کی وضع داریوں سے پوری طرح واقف ہیں اور اس کے اندر تیز رفتاری سے آنے والی تبدیلیوں، کشمکش اور خاندان کے ٹوٹنے اور بکھرنے کے راز کو جرأت مندانہ صلاحیت سے نمایاں بھی کرتی ہیں۔ افسانہ ''بہو بیٹیاں'' ہندستانی سماج کی بدلتی ہوئی مختلف شکلوں والی چار عورتوں کی کہانی پر مشتمل ہے، ایک وہ عورت ہے جو کم پڑھی لکھی ہے، جس کی زندگی شوہر پرستی، بچہ جنی، اور چہار دیواری کی اسیری تک محدود ہے، دوسری عورت شادی شدہ اور تعلیم یافتہ ہے جو اپنے شوہر پر حاوی رہتی ہے، تیسری عورت بھی شادی شدہ ہے لیکن اس کو ازدواجی زندگی کے باہمی رشتے سے کوئی سروکار نہیں آزادانہ اور جداگانہ طریقے سے زندگی گذارنا چاہتی ہے، جنسی معاملات میں اشتراک اس کے نزدیک کوئی مسئلہ نہیں، چوتھی عورت بھی جنسی بے راہ روی کی شکار ہے مگر اس نے شادی نہیں کی ہے، ہر روز نئے مردوں کے ساتھ تعلق قائم کرتی ہے اور اسے اپنا معاشی ذریعہ بنالیتی ہے۔ ان چاروں عورتوں کی زندگی کی وضاحت کے بعد یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس دور کے ہندوستانی سماج، خاندان اور معاشرہ میں تبدیلیوں کی حرکت و رفتار کتنی تیزی سے بڑھ رہی تھی اور ان میں مغربی اقدار کس طرح مداخلت کر رہے تھے۔

ان کا افسانہ کلوّ ہندستانی سماج اور خاندان کی اس صورت حال کو بیان کرتا ہے جس میں تعلیمی بیداری آرہی تھی اور جاگیردارانہ نظام زوال آمادہ تھا۔ اس کا مرکزی کردار کلو نہایت معمولی گھر سے تعلق رکھتا ہے اس نے غربت کے سبب ایک ایسے خاندان میں بچپن گزارا ہے جہاں وہ ایک نوکر، بیرے اور مہتر کا سارا کام کرتا تھا۔ اس کی ماں بھی امیر گھرانوں میں دایہ تھی۔ لیکن ایک دن کلو کو اس گھر سے بھگا دیا جاتا ہے۔ چند سالوں بعد وہ ایک کلکٹر بن کر اس گھر والے کو دعوت دیتا ہے جہاں چند سالوں پہلے اس کی بے قدری ہوئی تھی، اس کی ناقدری کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس نے لاشعوری طور پر سلیمہ سے شادی کا اظہار کیا تھا۔ اور اب جب کہ وہ کلکٹر بن گیا ہے سلیمہ کے گھر والے اس سے رشتہ طلب کرتے ہیں۔ جب کہ روایتی خاندان میں کفو اور برادری سے باہر رشتے کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جب یہی جاگیردارانہ خاندان مالی حالت سے دوچار ہوتا ہے اور اپنی سبھی لڑکیوں کی شادی برادری کے خاندان میں کرانے کی اہلیت نہیں رکھتا ہے تب ان کے نزدیک روایتی اصول کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ دوسری طرف کلو جس کی سماج میں کوئی حیثیت نہیں تھی محض تعلیم کی وجہ سے اس خاندان میں شادی کرنے کا اہل ہو جاتا ہے جس کی ہمسری کا خیال تک نہیں کرسکتا تھا۔ تیسرے یہ کہ اس افسانے میں ہجرت سے پیدا شدہ بکھراو کے مسائل کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ غرض کہ جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ، تعلیمی بیداری کا عروج اور ہجرت سے پیدا شدہ بکھراو کے نتیجے میں خانگی زندگی کے اندر جو تبدیلی پیدا ہو رہی تھی ان سبھی مسائل کو اس افسانے میں بیان کیا گیا ہے

مندرجہ ذیل اقتباس سے اس صورت حال کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

'' آدھا خاندان ہندستان میں، آدھا پاکستان میں، لڑکیوں کے

لیے برملنا مشکل ہو گئے۔ حمیدہ سے چھوٹی سعیدہ، میمونہ اور سلیمہ تعلیم ختم کر کے شادی کے انتظار میں سوکھنے لگیں۔ ویسے سشما، احمد اور ریحانہ خالہ کی لڑکیاں بھی جوان بیٹھی تھیں۔ سال بھر سے وہ پاکستان جا کر لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر میں تھیں۔ ہمارے خاندان میں کچھ لڑکیاں ہیں بھی بہت۔ ایک لڑکے کے پیچھے چار لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں۔ چچا میاں دن رات لڑکوں کی تلاش میں لگے رہتے ہیں۔ انہی نے ملیحہ باجی کی شادی کرائی تھی۔ وہی ذرا سرکاری حلقوں میں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ مگر وہ بھی مجبور تھے۔ زمانہ ہی ایسا خراب ہے کہ لڑکے ملتے ہی نہیں۔ جو ملتے ہیں منہ پھاڑ کر جہیز میں موٹر اور ولایت جانے کا خرچ مانگتے ہیں۔ ایک دو لڑکیاں ہوں تو کوئی دے بھی دے اتنی بڑی فوج کو بھلا کون بھگتے۔ ویسے زمین داری کے ختم ہو جانے سے رہی سہی ساکھ بھی ختم ہو چکی۔ نہ وہ دعوتیں نہ پارٹیاں نہ اتنا میل جول، لڑکیوں کے نصیبے کھلیں تو کیسے۔ پھر بھی جہاں دعوت پارٹی ہوتی، لڑکیوں کو ضرور لے جایا جاتا۔ ایسے موقع کم آتے تھے۔ اس لیے جب نئے ڈپٹی کلکٹر مسٹر دین کے اعجاز میں پارٹی دی گئی اور بلاوا آیا تو کئی دن پہلے سے تیاریاں ہونے لگیں۔'' (۲)

اس اقتباس سے جس صورتحال کی عکاسی ہوتی ہے اس کا زمانہ پوری بیسویں صدی کو محیط ہے۔ لیکن نصف صدی سے قبل کے زمانے میں اس کی رفتار کیا تھی، اس میں سماج، خاندان اور معاشیات میں تعلیمی بیداری اور جاگیرداری کے خاتمے سے کس کس طرح کی تبدیلی پیدا ہو رہی تھی اس کو عصمت چغتائی نے اس افسانے میں بیان کیا ہے۔

ان کے بیشتر افسانے جدید اور قدیم تصادمات پر مبنی ہیں۔ ہندستان میں شعوری بیداری کے بڑھنے سے اخلاقی معاشرتی اور خانگی زندگی کے گوشے جس طرح وسیع ہو رہے تھے عصمت پر وہ سب روشن تھے، اسی وجہ سے ان کی کہانیوں کا محل خانگی زندگی کی ناہموار بنیادوں پر استوار ہے، وہ خاندان اور گھریلو معاملات کو پیش کرنے میں ملکہ رکھتی تھیں۔ وہ اپنی تحریروں کے ذریعہ بے بس مشرقی عورت کی پیکر تراشی کر کے معاشرے میں اس کو مقام دلانے میں ہمیشہ کوشاں رہی ہیں۔

خواجہ احمد عباس نے اردو میں بہت افسانے لکھے، ہندوستانی معاشرت کے ہر طبقے اور خاندان سے کرداروں کا انتخاب کیا اور ہندوستان کی بدلتی تصویر کو فنکارانہ طریقہ سے ان افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ خواجہ احمد عباس مارکسی نظریات کا سہارا لیکر سوشل نظام حیات کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش میں افسانے کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں اور سماج و

معاشرہ کی پیچیدگیوں کو افسانوں میں اجاگر کرتے ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ آج کا ہندوستان آج سے نصف صدی قبل کے ہندوستان سے بڑی حد تک مختلف ہے اور آئندہ نصف صدی کا ہندوستان کچھ اور ہی ہوگا۔

خواجہ احمد عباس ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس میں اعتدال پرستی اور میانہ روی کا رواج تھا، ان کے خاندان کا ہر فرد سادہ اور جفاکش زندگی کا عادی تھا۔مغربی فیشن زدگی سے جتنی بیزاری تھی اتنی ہی مشرقی اور خاص کر ہندوستانی توہمات اور غیر ضروری رسوم سے بھی منافرت تھی۔ ہندوستان میں اس طرز کے خاندان زیادہ تر اعلیٰ طبقے میں پائے جاتے تھے، متوسط طبقے کی تعداد جیسے جیسے بڑھ رہی تھی ان کی خانگی زندگی میں تبدیلیاں رونما شروع ہو رہی تھیں خاص کر تیسری دہائی کے بعد لوگوں کو طرز کہن سے یک سر انحراف اگر چہ گوارہ نہیں تھا۔لیکن اس عہد میں سماج نئے نئے خیالات سے آشنا ہو رہا تھا اور اس کا اثر افراد پر بھی نمایاں طور پر دیکھا جا رہا تھا۔خواجہ صاحب نے آپ بیتی کو جس طرح 'ساری دنیا میری' میں بیان کیا ہے اس سے ہی اس عہد کے قدروں کی شکست و ریخت کا اندازہ ہوتا ہے سماج اور معاشرے میں کس طرح چھوٹی چھوٹی قدریں گم ہوتی جا رہی تھیں۔عقیدہ و مذہب کے تئیں شدت پسندی سہل پسندی کی صورت اختیار کر رہی تھی اگر چہ آج تک اس صورت کی تکمیل نہیں ہو سکی ہے۔

ان کا ایک افسانہ، لڑکی، 1938ء کے مسلم معاشرے کی کہانی ہے جس میں سلمیٰ مرکزی کردار ہے وہ ایک ادارہ میں داخلہ لیکر مخلوط تعلیم کی ابتدا کرتی ہے۔لیکن اس معاشرے میں چونکہ ایسی روایت نہیں تھی اس لئے لوگ اس کے اور اس ادارے کی مخالفت میں مقدمہ دائر کر دیتے ہیں۔اس افسانے میں ایک تو سماج اور معاشرہ کے اس رویہ کی طرف نشاندہی کی گئی ہے کہ قدامت پرستی ابھی بھی کس طرح غالب ہے۔دوسرا یہ کہ ہندوستان میں عورتوں کے تئیں خاندان میں بیداری آ رہی تھی۔مخلوط تعلیم سے مستقل خانگی زندگی میں تبدیلیوں کے نئے امکانات پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے۔سلمیٰ قدیم طرز حیات کے خلاف علم بغاوت اٹھاتی ہے اور فرسودہ رسم و رواج سے انحراف کرتی ہے لیکن معاشرتی نظریات اس کو تبدیل نہیں کر پاتے۔

خواجہ صاحب نے وقت اور حالات کا پورا مطالعہ کیا، انسانی زندگی سے تجربات حاصل کئے زندگی کی نت نئی مشکلات اور مسائل کا بغور مشاہدہ کیا۔ان کے جذبہ اظہار میں بے باکی ہے۔بایں وجہ انہوں نے سرمایہ دارانہ نظام، جاگیردارانہ ہیئت کی خباثتوں، رجعت پسندی اور تنگ نظری کے خلاف اپنی تمام توانائی صرف کیا ہے۔شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی، اخلاقی پستی، صنعتی ترقی کے ساتھ معاشرے کی دوسری چیزیں اس رفتار سے ترقی پذیر نہیں تھیں۔معاشی، سماجی، تہذیبی، اخلاقی، تمدنی اور خانگی زندگی کے مسائل اس طرح الجھے ہوئے تھے کہ انسانیت کی قدر بری طرح پامال ہو رہی تھی۔ذہنی کم ظرفی بڑھ رہی تھی۔انسان نئے زاویئے سے سوچنے لگا تھا، ہمدردی، ایثار و قربانی اور اخلاقی اصول کو اضافی تصور کیا جانے لگا تھا۔لاتعلقی، مفاد پرستی، دھوکا دہی، ایک دوسرے کے تئیں حقارت و نفرت کی گہما گہمی اور دیگر ایسے مسائل تھے جس سے سماج پوری طرح گھرا ہوا تھا۔ایسے میں خاندان کے نظم و ضبط، طرز رہائش اور اس کا اتالیقی رویہ بھی

متاثر ہو رہا تھا۔ خواجہ صاحب نے ان سب مسائل کے نتیجے میں ہونے والی خانگی، روایتی اور تہذیبی قدروں میں تبدیلیوں کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ اور شہر اور دیہات کے مشترکہ خاندان اور چھوٹے کنبے کے تصور کو بھی اجاگر کیا ہے۔ وہ معاشرے اور خاندان کی پستی کے اسباب کا بغور مطالعہ کرتے ہیں، انہیں پامال ہوتے دیکھ کر اکثر سوچتے ہیں اور اس کے بعد ان سے تجربات حاصل کر کے افسانے کا موضوع بناتے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعہ پاؤں ،دیا جلے ساری رات، زعفران کے پھول، جس کو عشق کہتے ہیں۔ گیہوں اور گلاب اور میں کون ہوں، کے بیشتر افسانے روایتی اقدار سے گریز اور خانگی زندگی کی کشمکش کے عکاس ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کے مطالعہ سے اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ ان میں ہندوستان کی سماجی زندگی سے حاصل کردہ غیر معمولی تجربات ومشاہدات کے مرقعے جا بجا موجود ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی اس عہد کے تجربہ کار افسانہ نگار ہیں۔ وہ تجربات ومشاہدات کے قائل ہیں۔ اور انہیں تجربات و مشاہدات کو وہ فنکاری کا روپ دیتے ہیں۔ جو اہم، غیر معمولی اور انوکھا ہوتا ہے۔ ان کی کہانیوں کے واقعات معمولی ہوتے ہوئے بھی نہایب معنی خیز اور اہم ہوتے ہیں۔ ''گرم کوٹ'' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں تجربہ بہت معمولی ہوتے ہوئے بھی باریک اور فکر انگیز ہے۔ اس میں چھوٹی فیملی کے اقتصادی حالات اور اس کے پس پردہ ان کی کیفیت کو ایک کلرک اور اس کی گھریلو اور روزمرہ کی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ اگر چہ متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والے کلرک کی زندگی کو بہتوں نے افسانے کا موضوع بنایا ہے، لیکن ان کے اس موضوع میں جو فنکارانہ کمال ہے اس سے ایک نئی لذت محسوس ہوتی ہے۔ اس افسانے میں بیدی نے ان مسائل کو ذکر کیا ہے جو تعلیمی ترقی کے بعد متوسط طبقہ کے خاندان میں پیدا ہو رہی ہیں، ایک شخص جو وکالت کے پیشے سے وابستہ ہے اور ایک نیوکلیئر خاندان کی زندگی کو اپنائے ہوئے ہے۔ لیکن اس کی آمدنی ،خود کی زندگی ،گھریلو پریشانیاں اور بچوں کی ضرورت کے لئے کافی نہیں، یہاں تک کہ ذاتی خواہشات بھی پوری نہیں ہو پاتی۔ مشترکہ خاندان کی آسودہ حال زندگی کی اہمیت کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے اس میں کم از کم انسان ذہنی اضطراب اور قلبی تردد میں مبتلا نہیں ہوتا تھا۔ اس افسانے میں دور نو کے انسان اور اس کی گھریلو زندگی کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔ اس میں ایسے خاندان کے المیہ کو موضوع بنایا ہے جو اس خاندان کی داخلیت کی ٹوٹ پھوٹ پر مبنی ہے، بیدی نے اس افسانے میں یہ واضح کیا ہے کہ معاشرتی اور تہذیبی اقدار کی شکست اور بکھراؤ کے ساتھ ساتھ اقتصادی پستی نے انسان کو اپنی ذاتی خواہشات کی اذیت میں مبتلا کر دیا ہے۔

بیدی نے گھر کی چہار دیواری کے اندر اور خاندان کی زندگی کے باطنی مسائل کے ساتھ ساتھ خاندان کے نظم و ضبط کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ،افسانہ لمبی لڑکی، میں انہوں نے متوسط طبقہ کے ایک خاندان جو دادی، ماں، باپ، بھائی اور بھابھی پر مشتمل ہے، ان تمام کردار سے جڑے واقعات ونفسیات کے پردے میں بیدی نے گھریلو معاشرہ مشترک خاندان پر محمول طرز زندگی اور اس کی آسانیوں ودشواریوں کا اظہار کیا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی نئے طبقاتی کشمکش اور جدید تہذیب وتمدن کی موضوعات کو اپنے افسانوں میں کئی طریقوں سے پیش کرتے ہیں، ان کے افسانوں کا موضوع ہندستان کے ہندو اور سکھ کے متوسط طبقے کے خاندان ہیں، ان میں روزمرہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے حادثات کو قلم بند کیا گیا ہے۔ اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں

''بیدی کی کہانیاں ہندو اور سکھ متوسط طبقے کے گھرانوں کی زندگی سے متعلق ہیں یہ اس زندگی کی بھرپور تصویریں نہیں ہیں بلکہ پوری زندگی میں سے صرف ان مواقع یا صورت حال کو چن لیا گیا ہے جن سے سماجی زندگی کا کوئی مظہر یا انسانی فطرت کا کوئی گوشہ بے نقاب ہوتا ہے،،(۳)

ان کے افسانے گرم کوٹ، اپنے دکھ مجھے دے دو، لاجونتی، صرف ایک سگریٹ، بھولا، گرہن، بولو وغیرہ عمدہ تخلیقات ہیں جن میں سماج اور خاندان، تہذیب اور تمدن میں در آنے والے نئے نئے بدلاؤ کی عکاسی کی گئی ہے اور پرانے قدروں سے انحراف کا ذکر کیا گیا ہے، افسانہ اپنے دکھ مجھے دے دو کی کہانی ایک خاندان اور گھریلو زندگی کا خاکہ پیش کرتا ہے، اندو کا کردار مرکزی حیثیت کا حامل ہے جو بہ یک وقت ماں بھی ہے اور بیٹی بھی، بہو بھی ہے اور بیوی بھی، اپنے شوہر کے ساتھ ساتھ پورے گھر والوں کو سکھ پہنچانے کی ہمیشہ کوشش کرتی ہے لیکن جب اس کے دیور کی شادی ہو جاتی ہے تو اس خاندان میں ٹوٹنے اور بکھرنے کا احساس شروع ہونے لگتا ہے۔

''نئی بھابھی آئی، کہنے کو تو وہ بیوی تھی لیکن اندو ایک عورت تھی جسے بیوی کہتے ہیں۔ اس کی الٹ چھوٹی بھابھی رانی ایک بیوی تھی جسے عورت کہتے ہیں، رانی کے کارن بھائیوں میں جھگڑا ہوا اور جے پی چچا کی معرفت جائداد تقسیم ہوئی جس میں ماں باپ کی تو ایک طرف اندو کی اپنی بنائی ہوئی چیزیں بھی تقسیم کی زد میں آگئیں اور اندو کلیجہ مسوس کر رہ گئی جہاں سب کچھ مل جانے کے بعد اور الگ ہو کر بھی کندن اور رانی ٹھیک سے نہیں بس سکے تھے وہاں اندو کا اپنا گھر دنوں ہی میں جگمگ کرنے لگا۔،،(۴)

اندو اپنی گھریلو زندگی اور مشترکہ خاندان کی بقا اور حفاظت کے لئے اپنے ساری خوشیاں قربان کر دیتی ہے لیکن اس کے دیور کی بیوی رانی دونوں بھائیوں میں جھگڑا کرا دیتی ہے اور جائداد کی تقسیم بھی دوسری طرف اس افسانے میں بیدی نے انسانی فطرت کے بھی پہلوؤں کی عکاسی کی ہے، اس میں مرد کی بے اعتنائی اور اس کی بے راہ رویوں کا بھی ذکر ہے مدن کے کردار کی کمزوریوں کو بھی پیش کیا ہے جو سیتا جیسی معصوم عورت کو چھوڑ کر دوسری عورتوں سے بھی تعلق بھڑاتا ہے لیکن جلد ہی اسے اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کے اندو ایک عظیم عورت ہے اور اس کی عظمت کا مقابلہ نہ ہی پھولا ن اور رشیدہ کر سکتی ہے اور نہ ہی مسز رابرٹ اور ان کی بہنیں، اس میں بیدی متوسط طبقے کے نوجوان کی تصویر

کشی کرتے ہوئے اس بات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ متوسط طبقے کے نوجوانوں کی جب مالی حالت بہتر ہوتی ہے تب وہ مالدار آدمیوں کی طرح عیاشی کرنا چاہتے ہیں دوسری عورتوں سے راہ ورسم بڑھاتے ہیں جب کہ اس کی بیوی پیسہ بچا بچا کر اور خود محنت کر کے مالی حالت کو اچھا بناتی ہے، یہ تحریر متوسط طبقے کے نوجوان طبقے کی بے راہ روی کی مظہر ہے جو متوسط طبقے کے دوغلے پن کو ظاہر کرتی ہے۔

قرۃ العین حیدر اردو افسانے کے منظر نامے پر اس وقت نمودار ہوئیں جب زندگی کے ہر شعبے میں کشمکش عروج پر تھی، برطانوی سامراج کے دن گذرنے والے تھے، نئے نئے سیاسی، معاشی، سماجی اور خانگی نظم وضبط کے منفی ومثبت نتائج ظہور میں آنے لگے تھے، جن سے سماج کا صدیوں پرانا جمود تیزی سے حرکت پذیری اور ترقی کی جانب رواں دواں تھا، اس کے علاوہ جدید تکنیکی ایجادات، سائنسی علوم اور مغربی ادب وکلچر کے اثرات روز بہ روز گہرے ہو رہے تھے، قدیم تہذیبی افکار واقدار پر فرسودگی کا لیبل چسپاں کیا جا رہا تھا۔ اس طرح نئے خیالات وتصورات نے سماج کو جدید و قدیم کی کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔ قرۃ العین حیدر نے ان تبدیلیوں کے اثرات سے اپنی تخلیقی اظہار کے لئے صنف افسانہ اور ناول کا انتخاب کیا اور تاریخ کے مثبت فکری اور تعمیری شعور کا سہارا لیکر عصری زندگی کے مسائل کو موضوع بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں یا ناولوں میں نہ صرف بیسویں صدی کے ایک خاص دور کا ہندوستان اپنی تمام تر رعنائیوں، ہنگاموں، انقلابی تحریکوں اور ذہنی وجذباتی رویوں جیسے موضوع شامل ہیں بلکہ انہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ سماجی، تہذیبی اور خانگی زندگی کے خارجی مسائل، غیر ملکی مصائب اور تاریخی حقائق کو بھی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں موضوع ومواد کے دائرہ کار کی وسعت اور نوعیت کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ انہوں نے دنیا اور ساکنان دنیا کی تاریخی ترتیب کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا اور جدید وقدیم کے تصادمات سے تجربہ حاصل کیا تھا۔ قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں عالمی تاریخ اور ملکی معاشرے کی تہذیب وثقافت، رہن سہن، خورد ونوش، عادت واطوار، عقائد وتوہمات اور اخلاق وروایت کے مرقعے جا بہ جا ملتے ہیں۔ انہوں نے اپنے احساسات وجذبات کو تجربات ومشاہدات سے ہم آہنگ کر کے انہیں افسانوں میں اس طرح ڈھالنے کی کوشش کی ہے گویا انسانی، خانگی اور سماجی زندگی کا بڑا حصہ ان کے افسانوی اظہار سے ہی عبارت ہو کر رہ گیا ہے۔

قرۃ العین حیدر کا افسانہ ''یاد کی ایک دھنک جلے'' خاندان میں تبدیلیوں کے موضوعات پر لکھا گیا عمدہ افسانہ ہے اس افسانے میں کئی علاقے سے تعلق رکھنے والے کئی خاندان کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ناصر چچا کا خاندان جو قدامت پرستی اور وضعداری پر مبنی تھا اب ممبئی جیسے میٹروسیٹی کے شہری خاندان میں تبدیل ہو گیا ہے۔

> ''ناصر چچا مٹیا برج کلکتہ کے ایک ماضی پرست قدامت پسند اور
> وضعدار خاندان کے ایک فرد تھے وہ ابا جان کے بہت پرانے دوست تھے
> اور بے حد شگفتہ طبیعت دور پڑھے لکھے انسان تھے اردو فارسی انگریزی

ادبیات کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور فائز بریگیڈ کے محکمے میں ملازمت کرتے تھے۔ ممبئی میں سمندر کنارے ان کا بہت لمبا چوڑا فلیٹ تھا جس طرح کہ پرانی وضع کے فلیٹ گارے اور سیمنٹ کے جگمگاتے ہوئے دس منزلہ رہائشی بلاک تعمیر کئے جارہے تھے۔''(۵)

اس میں گریسی کا کردار ایک ایسے خاندان کی عکاسی کرتا ہے جو تبدیلیوں سے دوچار ہوا ہے، جس میں روایتی طریقے عمل سے وابستگی کا رجحان تھا، اس کے بعد جب اس نے شادی کی تب یہی خاندان محض میاں بیوی پر مبنی خانگی زندگی میں بدل گیا، چند دنوں بعد اس کا شوہر مر جاتا ہے اور وہ ناصر چچا کے گھر میں نوکرانی بن جاتی ہے، یہاں وہ گھریلو کاموں کے ساتھ ناصر چچا کے بچے کی دیکھ بھال بھی کرتی ہے، ناصر چچا شمالی ہندوستان کی تہذیبی روایت سے وابستہ تھے جبکہ گریسی جنوبی خطے کی رہنے والی تھی، دو مختلف سماج اور خاندان کے امتزاج سے ایک الگ طرح کی خانگی روایت جنم لیتی ہے جس کا اثر ناصر چچا کے بیٹے پر ہوتا ہے، ناصر چچا کو اس کا پورا احساس ہے، کیونکہ انہیں اپنی قدروں سے محبت ہے، وہ اپنے بیٹے کو دوسری تہذیب و روایت کی طرف مائل اور کلکتہ و عظیم آباد کی تہذیب سے منحرف دیکھ کر ملول خاطر بھی ہوتے ہیں لیکن چونکہ گریسی اسے ماں کی طرح مانتی ہے اس لئے وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے، اس افسانے کو پڑھ کر اقدار میں تدریجی تبدیلیوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور خانگی زندگی میں پیدا ہونے والی کشمکش کا بھی احساس ہوتا ہے۔ قرۃ العین حیدر راوی کی زبانی ان تبدیلیوں کو بیان کرتی ہیں:

''اصغر کی تربیت بے حد غلط ہو رہی ہے'' ناصر چچا افسوس سے اظہار کرتے۔ گریسی کی بے جا لاڈ و پیار نے اسے بالکل برباد کر دیا ہے۔ مگر میں گریسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔ بیگم مرحومہ اس سے اپنی چھوٹی بہن کی طرح محبت کرتی تھیں۔ اب میں اس کے ساتھ کس دل سے سختی کروں؟

جب اصغر، ہم جائینگا، ہم آئینگا، ہم تم کو بولا۔ قسم کی زبان میں باتیں کرتا تو ابا جان بھی بڑے صدمے سے کہتے ''یہ مٹیا برج اور عظیم آباد کے اس خاندان کا فرد ہے جو اردو ادب میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔''(۶)

خاندان کی روایت کی پامالی اور نئے معاشی تگ و دو کے طریقے سے خانگی زندگی میں کشمکش اور روایتی اقدار سے گریز کے نمونے اس افسانے کے آخری حصے میں بھی ملتے ہیں، جب اصغر تجارت کی غرض سے ڈھاکہ چلا جاتا ہے اور گریسی جو اگرچہ اس کی ماں نہیں تھی مگر سوتیلی ماں ہونے کے باوجود اصغر سے اس کے جذبات کی وابستگی اتنی گہری تھی کہ مثل حقیقی ماں ہمہ وقت اس کے لئے ایثار و قربانی کے لئے تیار رہتی تھی اس کو اصغر یہ کہتا ہے کہ تم اپنے گھر چلی جاؤ میں تجارت میں منہمک ہوں میرا کوئی ٹھکانہ نہیں۔

''میں کراچی واپس آ گئی تیس سال بعد اطلاع ملی کہ ناصر چچا کا انتقال ہو گیا اور علی اصغر بزنس کے لئے ڈھاکہ چلا گیا۔ اور مشرقی پاکستان روانہ ہونے سے قبل اس نے گریسی چچی سے کہا کہ بزنس کے سلسلے میں اسے جانے کہاں کہاں پھرنا ہوگا اور انہیں پردیس میں بہت زحمت ہوگی اس لئے وہ اپنے وطن واپس چلی جائے شاید وہ اپنے دوستوں کو یہ بتاتے ہوئے جھینپتا تھا کہ گریسی چچی اس کی ماں ہیں۔

اگر علی اصغر گریسی چچی کا سگا بیٹا ہوتا اور اس کو ان سے دلی، فطری محبت ہوتی تب بھی ممکن تھا کہ وہ اپنی شادی کے بعد ان سے یہی برتاؤ کرتا ۔ماؤں کے ساتھ اکثر یہی کیا جاتا ہے۔ اور گریسی چچی ماں تھیں۔''(۷)

قرۃ العین حیدر نے اس افسانے میں بہت سارے کرداروں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور اس کے ذریعہ خانگی اور معاشی زندگی کی تبدیلیوں کو بیان کیا ہے بدلتے ہوئے نظام اور اقدار کی شکست وریخت کے موضوع پر لکھا گیا یہ ایک عمدہ افسانہ ہے جس میں ناصر چچا کے کردار کے ذریعہ جہاں اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ مشترکہ خاندان سمٹ کر ایک فلیٹ کی زندگی میں تحلیل ہو جاتا ہے وہیں علی اصغر کے کردار سے یہ واضح ہوتا ہے مستقبل قریب میں خانگی زندگی اتنی سمٹ جائے گی کہ خانگی نظم وضبط کا باقی رہنا بڑی مشکل ہو جائے گا۔ قرۃ العین حیدر نے اس عبارت کے ذریعہ ماضی کی خانگی زندگی کی وضعداری کے ساتھ ساتھ اسلوب زیست کے جدید زاویوں کی بھی عکاسی کی ہے۔

قرۃ العین حیدر کا افسانہ ''پت جھڑ کی آواز'' میں ایک اعلیٰ خاندان کی رہنے والی تنویر فاطمہ مرکزی کردار کی حیثیت رکھتی ہے اس کے ذریعہ پرانے معاشرتی نظام کی تمام دیواروں کو منہدم ہوتے ہوئے دیکھا گیا ہے کہ ہندوستانی سماج جس میں عورت مختلف طرح کے اندیشوں، محرومیوں اور کرب انگیز پیچیدگیوں سے ہمیشہ گھری رہتی تھی۔ نئے معاشرے کے ڈھانچے کے خطوط پر اب پوری طرح گامزن نظر آنے لگی ہے۔ زندگی کے ہر فیصلے میں آزادانہ طریق سے کام لیتی ہے۔ معیاری اور حیات افریں طرز زندگی کا پیمانہ ذاتی پسند وناپسند تک منحصر ہو گیا ہے، اس افسانے میں تنویر فاطمہ کی ایسی تصویر کشی کی گئی ہے جس کی اقدار نو کی بصیرت اتنی گہری ہے کہ شادی یا جنسی زندگی کے تمام قید وبند سے آزاد رہنا چاہتی ہے۔ آخر کار وہ چند مردوں سے عارضی طور پر وابستہ رہنے کے بعد ایک مرد کے بندھن میں بندھ جاتی ہے لیکن اس کے باوجود داخلی اضطراب میں مبتلا رہتی ہے۔ غرض کہ قرۃ العین حیدر نے معاشرتی تبدیلیوں کو خاص کر عورتوں کے حوالہ سے پیش کیا ہے اور معاشرتی اخلاقیات کے پرانے نظام تصور اور سماجی وتہذیبی انتشار کو بیان کیا ہے۔

سہیل عظیم آبادی تیسری دہائی کے بعد ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں امتیازی حیثیت کے حامل ہیں، ان کے افسانوں میں بہار کے مسائل کی پیچیدگیاں جا بجا ملتی ہیں۔ وہ اپنے افسانے کے موضوعات، علاقائی حدود سے ہی

اخذ کرتے ہیں لیکن ان کے پیش کش کا انداز واسلوب اس طرح ہے کہ ان میں ہمہ گیریت پائی جاتی ہے۔انہوں نے افسانے کی روایت کو اپنے عہد کی بدلتی ہوئی سچائیوں اور گہرائیوں سے ہم آہنگ کرنے کی سعی کی ہے۔اعلیٰ انسانی قدروں اور زندگی کی سچائیوں سے سہیل عظیم آبادی انحراف نہیں کرتے اس لئے ان کے افسانوں میں رشتوں کی جزئیات، خانگی نظام حیات اور سماجی و معاشرتی شکست وریخت کا بیان کہانی کو موثر نقطہ تک پہونچا دیتا ہے۔'جہیز'، 'چوکیدار'، 'اولاد'، 'جوار بھاٹا'، 'بے چارہ'، 'اپنا پرایا' 'دو مزدور' اور 'جینے کے لئے' سہیل عظیم آبادی کے ایسے افسانے ہیں جن میں ان کے فن کا اسلوب نمایاں ہے، حقیقت نگاری کا سہارا لے کر سماج و خاندان کی پیچیدگیوں کے باعث روایتی اقدار اور مغربی تہذیب کے ترک واختیار کی کشمکش کی بھی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔اس کے علاوہ ان کی دیگر کہانیاں سماج اور کنبہ کی پیچیدہ رشتوں پر مبنی ہیں۔وقار عظیم لکھتے ہیں:

> ''ان کے افسانے زندگی کے اہم لمحات کے خاکے ہیں جو زندگی ہمیں سہیل کے افسانوں میں دکھائی دیتی ہیں اس کا پس منظر کئی چیزوں سے مل کر بنا ہے یہ چیزیں کہیں دیہات سے لی گئیں ہیں اور کہیں شہر سے۔کہیں غریبوں کی جھوپڑیوں سے اور کہیں امیروں کے محلوں سے۔ان میں زمین دار کی امین داری بھی ہے اور پٹواری کا راج بھی۔دیہات کے موسم اور مہینے بھی ہیں اور مہینوں اور موسموں کی چلتی ہوئی چکی کے پانٹوں کے بیچ میں آنے والے دیہاتی بھی۔ان کی آپس کی دشمنیاں بھی۔مقدمہ بازی بھی اور جھوٹی گواہیاں بھی۔پھر دیہاتوں سے نکل کر شہروں میں غریب مزدوروں کی ہر وقت گھرے رہتے ہیں اور اس ماحول کا بھی جو صرف اس لئے ان کا ماحول ہے کہ ہوا کے ایک ایک ذرے میں سرایت کر چکا ہے۔''(۸)

بھابھی جان:۔اس افسانہ میں سہیل عظیم آبادی نے ایک ایسے روایتی خاندان کی کہانی کو بھابھی کے کردار کے سہارے تخلیق کی ہے جس میں عورت ابھی بدلی نہیں ہے مشترکہ خاندان کی پرانی روایت سے وابستہ ہے اور اس کے فرائض کی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھاتی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت مشترکہ خاندان کو برقرار رکھنے میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے لیکن یہ فرض جس طرح خاندان کے ساس یا ماں پر عائد ہوتا ہے کیا اسی طرح خاندان کی بہو بھی اس فرض کی ادائیگی کے لئے ذمہ دار ہے۔سہیل عظیم آبادی نے انہیں سوالوں کو افسانہ بھابھی جان کا موضوع بنایا ہے۔اس میں سہیل عظیم آبادی نے ''رقیہ بھابھی'' کی نرم فطرت کا سہارا لے کر خاندانی روایت اور فرائض کے تحفظ کے اس طرح ذرائع مہیا کئے ہیں کہ بھابھی کی جرأت اور ایثار وقربانی، خاندان کی آبرو کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

''رقیہ بھابھی'' جو بڑے ناز ونعمت میں پلی ہے لیکن ایسے گھرانے میں اس کی شادی ہو جاتی ہے جس میں

آسائش میسر نہیں دوسرا یہ کہ ان کے شوہر بھی سیاسی انہماک کی وجہ سے جیل میں رہتے ہیں اس کے باوجود بھابھی گھر کے اخراجات کی باگ ڈور اپنے ذمہ لے لیتی ہے۔ مزید یہ کہ وہ رفاہی کاموں کے لئے بھی امداد فراہم کرتی ہے جس کی وجہ سے گھر کی حالت بہت بہتر نہیں ہوتی ہے۔ اس بدحالی میں بھی جب اس کا دیور اپنی شادی کے لئے مشورہ کرنے آتا ہے اور ملازمت نہ ہونے کی وجہ سے آئندہ زندگی کے بارے میں فکرمند رہتا ہے، اس وقت بھی بھابھی اسے اسی گھر میں رہنے پر زور دیتی ہے۔

''تو بسم اللہ بیاہ کر کے آجاؤ، یہاں میرے ساتھ رہے گی میں بھی اکیلی ہوں'' ''اف'' بھابھی کی یہ بات سن کر مرا سر چکرا گیا۔ یہ عورت ہے یا عزم و ہمت کا ستون۔ اپنے لئے ہر روز ایک نیا بوجھ بڑھائے جاتی ہے۔ خود اپنی ضرورتیں اور ذمہ داریاں کیا کم ہیں مگر ہمت ہے اور ہمت کے سہارے شوہر کی دوری اور نظر بندی کا غم ہنس ہنس کر بھلائے جاتی ہے۔ میں نے ذرا سوچ کر جواب دیا۔ ''میں بھی یہی سوچ رہا تھا'' لیکن ابھی دیر ہوگئی۔ جمیلہ ابھی بیمار ہے'' (۹)

آزادی سے قبل جاگیرداروں کی شکست اور بے بس زندگی کے مرقعے ان کے افسانوں میں ملتے ہیں۔ انھوں نے اس زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اور ان کے گھرانوں اور خاندانوں کے ماحول کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ اس طرح گاؤں اور دیہات کے معاشرے میں کسانوں کی زندگی ان کی غربت اور فاقہ کشی زمین داروں کے ان پر بڑھتے ہوئے مظالم اور اس کے بعد ان کے اندر سیاسی بیداری اور آزادی کا شعور اور مظلومیت کے خاتمے کی جدو جہد یہ سارے مسائل ان کے افسانے الاؤ میں نمایاں ہیں۔ انہوں نے اپنے اس کسانوں اور نوجوان نسلوں کے درمیان ابھرتی ہوئی تبدیلیوں کو کسانوں کی گفتگو کے ذریعے واضح کیا ہے۔

''ہاں بہت بڑی سبھا ہوئی تھی، ایک سادھو جی آئے تھے، وہ سب کو ایک بات کہہ گئے۔ سب کسان ایک ہو جائیں۔ آپس میں مل جل کر رہیں۔ تب ہی زمیندار کے ظلم سے بچ سکتے ہیں... بھیا بات پتے کی ہے۔ ہم پر جتنا بھی ظلم ہوتا ہے، اسے کون جانے۔ سال بھر محنت کر کے اپجاتے ہیں۔ اور ہمارے ہی بال بچے بھوکوں مرتے ہیں۔ آگ دھیمی ہو چکی تھی اس لیے باڑھو کچھ اور بھی آگ کے قریب ہو گیا۔ اور بولا۔ مشکل کیا ہے۔ آج سے ہم ٹھان لیں کہ آپس میں مل کر رہیں گے۔ زمین دار کو بیگار نہیں دیں گے۔ کوئی ناجائز دباؤ نہیں سہیں گے۔ بس! دھرم پور میں تو ایسا ہی ہوا ہے۔ اب تو وہاں

چین ہی چین ہے۔''(۱۰)

اس اقتباس سے اس دور کی سماجی بیداری کے نقوش ابھرتے ہیں۔ وہاب اشرفی اس بارے میں لکھتے ہیں۔

''یعنی اس طرح زمین دار بھی مٹ جائے گا اور زمین داری کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ افسانہ نگار نے کہیں بھی واضح طور پر لفظوں میں پیشین گوئی نہیں کی ہے۔ لیکن جو اشارہ کیا ہے وہ اس نتیجے پر پہنچاتا ہے اس کے علاوہ ابتدائی مرحلے میں بھگوا کو لاٹھی سیدھی کرتے ہوے دکھایا گیا ہے۔ دراصل اس کا یہ فعل بھی محض کہانی کی آرائش کے لیے نہیں ہے، بلکہ اب نوجوان زمیندار کے خلاف برسر پیکار ہونے والے ہیں۔ اس کا یہ پیش خیمہ ہے۔ پھر متعلقہ گاوں کے ساتھ دھرم پور کا ذکر کیا گیا ہے جہاں بڑی بڑی سبھائیں پہلے سے ہی منعقد کی جا چکی ہیں اور افسانہ نگار یہاں یہ نقطہ پیش کرنا چاہتا ہے کہ کسانوں کی بیداری کی یہ لہر محض قامی نوعیت کی نہیں ہے۔ بلکہ یہ آگ بھڑک چکی اور تیزی سے تمام دیہاتوں میں پھیلنے والی ہے۔''(۱۱)

ہندستان کی تاریخ میں یہ زمانہ کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ اردو افسانے بھی اس تاریخ سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ اس دور میں نہ محض استحصال کے خلاف مہم شروع ہوتی ہے، بلکہ سماج و خاندان اور تہذیب و روایت میں جدید اور قدیم نظریے کا تصادم بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ سہیل عظیم آبادی نے اپنے افسانوں کے ذریعے سماجی خرابیوں کو بے نقاب کرنے فرد اور سماج کے باہمی رشتے کے بکھراو اور قدیم خانگی تہذیب و روایت کی بدلتی ہوئی حرکت و رفتار کو برتنے کی کوشش کی ہے۔

اردو کے افسانوی ادب پر بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے بعد اختر اور ینوی نے اپنے تخلیقی مزاج و اسلوب کی انفرادیت کا گہرا نقش مرتسم کیا ہے، انہوں نے سیاسی اور صنعتی ترقی کے باوجود ملازمت کی کمی کے نتیجے میں انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بڑھنے والی کشمکش اور خانگی و تہذیبی روایت میں نئے قدروں کی شمولیت کو اپنے افسانوی کردار و موضوعات کے ذریعے پیش کیا ہے، اختر اور ینوی نے جدید و قدیم نسلوں کے تجربوں کی سختیوں اور تلخیوں کے ردعمل سے پنپنے والے سماجی اور خانگی اضطراب کو اور انسانی قدروں کے زوال کے اذیت آمیز احساس کو عہد رفتہ کی تاریخ اور تہذیب کے حوالہ سے ''درخت کا قتل،، میں اظہار کیا ہے، اس افسانے میں درخت کو علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور سماج و خاندان کی مٹتی ہوئی تہذیب کا ہر پہلو سے احاطہ کیا گیا ہے ،انگریزی دور حکومت میں جس طرح ہندوستانیوں کی سیاسی جذبات اور آزادی کی تحریکات کو مٹانے کی کوشش کی جا رہی تھی اسی طرح تہذیبی قدروں کو بھی پامال کیا جا رہا تھا، درخت کے قتل سے ظاہراً ماحولیاتی فضا کی آلودگی پیدا ہوتی ہے، لیکن دراصل یہ علامت ہے مٹتی ہوئی

تہذیب کی وجہ سے سماج وخاندان میں پیدا ہونے والی بکھراؤ اور انتشار کی، اس افسانے میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ جس طرح پہلے درخت کی شاخیں کاٹی جاتی ہے پھر اسے جڑ سے اکھاڑ دیا جاتا ہے اس کے بعد اس میں نئے نئے پودے لگائے جاتے ہیں اور پھر اس کو جدید طرز کے پارک کی شکل میں بدل دیا جاتا ہے، اسی طرح سماجی اور تہذیبی قدروں کی پامالی کا عمل ہے کہ پہلے اس میں فرد کے اندر دیگر اقدار کی حرص پیدا ہوتی ہے پھر شعوری بیداری آتی ہے، دھیرے دھیرے وہ بدلاؤ کا شکار ہوتا ہے اس کے بعد سماج اس سے متاثر ہوتا ہے، سماج اور تہذیب کے سارے انسلاکات کو دقیانوسی خیال کرتا ہے پھر سماج اور خاندان میں نئی نئی قدروں کی مداخلت شروع ہوتی ہے، اور پرانی قدروں کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔ اس افسانے میں اس کا عکس استعارے کے طور پر دکھائی دیتا ہے۔

> ''لوگوں میں یہ مشہور تھا کہ یہ درخت بھی متحرک ہے۔ اور اس کے خطے کی خاک پاک ہے۔ جب انگریزوں کا راج ہوا تو لیفٹیننٹ گورنر نے سخت دباؤ ڈال کر یہ باغ مہاراجہ سے اونے پونے داموں خرید لیا۔ یہیں سرکار بہادر کی کوٹھی بنی۔ مگر باغ کا بڑا حصہ قائم رہا اور وقت پر پھل دیتا رہا۔ قبریں رفتہ رفتہ منہدم ہو گئیں اور ان کے نشانات بھی مٹ گئے۔''

انگریزوں نے مذہبی عقائد اور روایتی وتہذیبی مقامات کی صورت مسخ کر کے نئے وضع کی کالونی تعمیر کرائی۔ اور دھیرے دھیرے ایک بہت بڑا درخت جس کی آبیاری شہدا کے خون سے ہوئی تھی اس کو بھی مٹا دیا۔ وہ درخت جس سے لوگوں کی عقیدت تھی اور جس کو سماجی اور تہذیبی روایت کا سرچشمہ تصور کیا جاتا تھا اس میں نہ صرف تبدیلی آئی بلکہ اس کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔ اس افسانے میں باغ اور درخت مٹتی ہوئی تہذیب کی علامت ہیں۔ اور نئی قدروں کے سماج میں داخل ہونے کے امکانات نظر آتے ہیں۔ اسی طرح ان کا افسانہ ''سیکھ ظہور'' بھی جاگیردارانہ خاندان کی شان وشوکت کے زوال کا عظیم مرقعہ ہے۔ اس میں نئے زمین داروں کے ظہور اور پرانے جاگیرداروں کے خاتمے کو اجاگر کیا گیا ہے۔ شادی کا تحفہ میں بھی انھوں نے بے روزگاری سے پیدا ہونے والے خانگی مسائل کو نفسیاتی پیرایے میں بیان کیا ہے۔

حواشی

(۱) اطہر پرویز، کرشن چندر اور ان کے افسانے۔ص:۵۹

(۲) عصمت چغتائی کے افسانے (اول)۔ص:۲۱۳

(۳) اسلوب احمد انصاری، ادب اور تنقید۔ص:۲۹۲

(۴) راجندر سنگھ بیدی، اپنے دکھ مجھے دے دو۔ص:۱۵۰

(۵) قرۃ العین حیدر، پت جھڑ کی آواز۔ص:۹۲

(۶) قرۃ العین حیدر، پت جھڑ کی آواز۔ص:۹۷

(۷) قرۃ العین حیدر، پت جھڑ کی آواز۔ص:۱۳۱

(۸) وقار عظیم، نیا افسانہ۔ص:۱۷۹۔۱۸۰

(۹) قمر رئیس، نمائندہ اردو افسانے۔ص:۱۱۳

(۱۰) قمر رئیس، نمائندہ اردو افسانے۔ص:۱۱۳

ہجرت سے پیدہ شدہ بکھراؤ

1947 میں آزادی حاصل ہوئی، اس سے متعلق واقعات ،اس سے جڑے تحریکات اور سیاسی مجاہدات سے ملک کے ہر شعبے میں عمومی بیداری پیدا ہو رہی تھی اور اس کے اثرات فرد اور جماعت ،سماج اور معاشرت ،آبادی اور خاندان پر مختلف النوع طریقے سے پڑ رہے تھے، آزادی کے بعد ہونے والی خونریزی و بربادی کی ہولناکیوں کا بیان کوئی فائدہ نہیں رکھتا، وحشیانہ قتل و غارت گری کے نتائج کیا تھے اور ان نتائج کے اثرات خاص کر خانگی زندگی پر کس طرح مرتب ہوئے ،گھریلو زندگی میں کیسے کیسے نئے مسائل جنم لئے اور اجتماعی وعوامی طرز معاشرت میں کس طرح کی تبدیلیاں رونما ہوئیں، ہجرت اور نقل مکانی سے پیدا شدہ مسائل سے دونوں ملکوں کی خانگی زندگی میں بکھراؤ کی کیا نوعیت رہی ،اگر مختصر افسانے میں ان ساری پیچیدگیوں کی پیش کش کا جائزہ لیا جائے تو اس کی فہرست بہت طویل ہے کیونکہ طویل مدت تک ان موضوعات پر افسانے لکھے جاتے رہے ہیں۔ہم یہاں ان افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا جائزہ لیں گے جو آزادی سے قبل افسانے کی دنیا میں پوری طرح داخل ہو چکے تھے اور آزادی کے بعد بھی فعال طریقے سے لکھ رہے تھے یا ان تخلیق کاروں کے افسانوں کو جن کے موضوعات پر ہجرت اور فساد کی دلدوزیاں حاوی ہیں۔

ابولیث صدیقی ہجرت اور فساد کے نتیجے میں پیدا ہونے حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

> ''بڑے پیمانہ پر تبادلہ آبادی نے اور بھی بہت سے معاشی اور اقتصادی مسائل پیدا کر دئے تھے سیکڑوں کارخانے اور فیکٹریاں تباہ و برباد حالت میں ویران پڑی تھیں، صنعتی اور تجارتی ادارے بند ہو گئے تھے اور ان کے کارکن منتشر ہو چکے تھے اور ہر چیز کو از سر نو شروع کرنا تھا، مہاجرین کے کچھ مسائل تو ایسے تھے جن سے حکومت کا بھی تعلق تھا لیکن بعض خالص سماجی مسائل اور معاملات ایسے بھی تھے جن سے خود مہاجرین کو عہدہ برآ ہونا تھا انہیں ایک ایسے ماحول میں اپنے لئے جگہ تلاش کرنا تھی جو ان کے لئے اجنبی تھا انہیں نئی زبانیں اور بولیاں نئی تہذیب اور معاشرت سے خود کو ہمنوا اور ہم آہنگ کرنا

تھا۔ ان کو رہنے کے لئے گھر اپنی اور اپنے اہل وعیال کی کفالت کے لئے
ملازمت یا کاروبار بھی تلاش کرنا تھا اور ان سماج دشمن عناصر کا بھی مقابلہ کرنا تھا
جو ایسے بحرانی دور میں ہمیشہ اپنی سرگرمیوں کو تیز تر کر دیتے ہیں''(۱)

تقسیم ہند نے مہاجرین کی سماجی اور خانگی زندگی کو یکسر بدل ڈالا تھا، اس وقت ان کی ترقی کے لئے حکومت ہند نے مختلف طرح کے پیشے کا منصوبہ بنایا، وہ خاندان جو کبھی سیکڑوں ایکڑ زمین کا مالک ہوا کرتا تھا مہاجرت نے اسے فقیروں جیسی زندگی گذارنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ خاندان جو کئی نسلوں پر مشتمل افراد کا مجموعہ تھا اور جو پشتوں سے قرابت داری کے نظام سے منسلک تھا ہجرت نے ان میں سے کئی افراد کو یا تو تہہ تیغ کر ڈالا یا وہ خود گم گشتگی کے شکار ہو گئے، اور سالوں بعد کسی دور کے رشتے دار سے آشنا بھی ہوئے تو حالات ایسے بن گئے تھے کہ ملنے کے سارے راستے مسدود تھے، خاص کر دہلی کی سرزمین سے ہجرت کرنے والے یا مہاجر کی صورت میں آنے والے ہزاروں افراد ایسے خاندان سے تھے جن کی مالی قوت کے ساتھ ساتھ خانگی نظام کی بھی ایک خاص ہیئت تھی لیکن جب یہاں آئے یا یہاں سے گئے تو انہیں سب کچھ چھوڑنا پڑا دہلی میں آنے والوں کے لیے باز آبادکاری کے منصوبے کے تحت جب انہیں مکان یا زمین کا الاٹمنٹ ہو رہا تھا تو بہت سارے ایسے علاقے کا انتخاب کیا گیا جہاں پہلے سے کچھ بھی آبادی نہیں تھی مثال کے طور پر کالے خان کا علاقہ جو جنگلات پر مشتمل تھا، لوگوں کو وہاں آباد کیا گیا، جنہوں نے کسمپرسی کے عالم میں ہر چیز اور ہر جگہ کو قبول کیا، ایک نئی زندگی کی شروعات کی، نئے خاندان کی تشکیل میں برسوں سرگرداں رہے۔ اور اقتصادی معیار کو تدریجی طریقے سے بڑھانے میں کوشاں رہے۔ وہ خاندان جو پوری طرح لٹ کر ہندوستان یا پاکستان میں اپنی ساکھ قائم کرنے میں کوشاں تھے ان میں پرانے حالات پر لوٹنے کا ایک عظیم جذبہ تھا اسی جذبہ کی وجہ سے بہت سارے خاندان کم مدت میں ہی تعلیمی، تجارتی اور اراضی کی ملکیت کے اعتبار سے ترقی کی بلندیوں پر پہونچے اور نئی تہذیب واقتدار کی روشنی میں خانگی زندگی کا سلسلہ شروع کیے۔ ایسے واقعات کی داستانیں دونوں ملکوں میں بہت ہیں کہ بکھراؤ اور انتشار کی کیفیت سے جوجھتے خاندانوں نے تجارتی صنعتی اور تعلیمی میدان میں اہم مقام حاصل کیے۔

تمام حالات کا جائزہ لیا جائے تو اس کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ آزادی، تقسیم اور فسادات کے المیے کا شکار ہر فرد تھا۔ ہر خاندان کسی نہ کسی طور پر متاثر ہوا تھا۔ اردو ادب کے ہر صنف میں ان موضوعات پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ اردو افسانے کی تاریخ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آزادی کے فوراً بعد کے اثرات اس پر بے حد مرتب ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ فسادات ہجرت، آبادکاری، جمہوری نظام کا قیام، خانگی زندگی کا نئے طریقے سے آغاز، معاشیات کے حل کے لئے نئی نئی منصوبہ بندیاں اور ان سب کے اثرات کا زندگی میں داخل ہونا، ان سب سے مواد حاصل کیا گیا اور وہ پھر تخلیقی ظہور میں آئے۔

''ہمارے جو افسانہ نگار ماحول کے اس اچانک حملے کی وجہ سے

بھونچکا اور دم بخود رہ گئے تھے انہوں نے پھر آنکھیں کھولیں اور پھر اپنے گردو پیش کی زندگی کا جائزہ لینا شروع کیا لیکن اس جائزہ میں انہیں زندگی کی صورت ہی بدلی نظر آئی۔ ہر چیز نئی نئی سی، ہر چیز تباہ شدہ اور مسخ، انسان اور انسانیت کو آنکھوں نے ہر طرف خاک وخون میں لت پت دیکھا۔ انسانیت کی ساری قدریں جنہیں انسان نے ہزاروں برس کی محنت ومشقت سے پالا پوسا اور پروان چڑھایا تھا۔ مجروح، سسکتی ہوئی، مرتی ہوئی دیکھائی دیں اور یوں معلوم ہوا جیسے نظر کے لئے اب تباہی، بربادی اور نیستی کے سوا کوئی منظر باقی نہیں رہا اس لئے تڑپتے، تلملاتے ہوئے افسانہ نگار نے بس انہیں مناظر کی منظر کشی، اس تباہی و بربادی کے ماتم اور زندگی کے زخموں کے مرہم کی جستجو کو اپنا مقصد حیات بنالیا اس نے فسادات کے افسانے لکھے''۔(۲)

ان افسانے نگاروں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، سعادت حسن منٹو، خواجہ احمد عباس، حیات اللہ انصاری، عزیز احمد، سہیل عظیم آبادی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، صدیقہ بیگم، اپیندر ناتھ اشک، قاضی عبدالستار ایسے افسانہ نگار ہیں جن کی تخلیقات میں تقسیم اور فسادات کی وجہ سے ہجرت اور قتل وغارت گری اور دیگر رونماں ہونے والی تبدیلیوں کے واضح اثرات ملتے ہیں، ہجرت سے پیدا شدہ بکھراؤ میں خاندان کی زندگی اور اس کی قدروں پر کیا اثرات مرتب ہوئے اور اس کے بعد خاندان کی ہیئت وساخت میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں ان سارے مسائل کی ان کے افسانوں میں تلاش وجستجو اس باب کے تحت کیا جائے گا۔

فسادات اور تقسیم ہند کے نتیجے میں انسان اور انسانی قدروں کی پامالی، سماجی اور خانگی بے چینی کو عصمت چغتائی اپنے مضمون ''فسادات اور ادب'' میں بیان کرتی ہیں۔

''فسادات کا سیلاب اپنے جوش وخروش کے ساتھ آیا اور چلا گیا۔ مگر اپنے پیچھے زندہ مردہ اور سسکتی لاشوں کے انبار چھوڑ گیا۔ ملک کے دو ٹکڑے نہیں ہوئے، جسموں اور زینوں کا بھی بٹوارہ ہو گیا۔ قدریں بکھر گئیں اور انسانیت کی دھجیاں اڑ گئیں۔ گورنمنٹ کے افسر، دفتر کے کلرک، میز کرسی قلم دوات اور رجسٹروں کو مال غنیمت کی طرح بانٹ دیا گیا اور جو کچھ اس بٹوارے کے بعد بچ رہا، ان پر فسادات نے دست شفقت پھیر دیا۔ جن کے جسم سالم رہ گئے، ان کے دلوں کے حصے بٹ گئے۔ ایک بھائی ہندستان کے حصے میں آیا تو دوسرا پاکستان کے۔ خاندانوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ زندگی کے

بندھن تار تار ہو گئے۔ یہاں تک کہ بہت سے جسم تو ہندستان میں رہ گئے اور
روح پاکستان چل دی۔''(۳)

ہجرت کی وجہ سے خاندان میں پیدا ہونے والے بکھراو کی صورت کا اندازہ پاکستان کے ایک اخبار کی اس خبر سے بھی ہوتا ہے جس میں دو بچھڑے ہوے بھائیوں کی ملاقات تریسٹھ سال بعد یعنی ۲۰۱۰ء میں ہوتی ہے۔ تقسیم ہند کی وجہ سے بچھڑنے والے احمد نور اور رحمت اللہ کی داستان یہ ہے کہ اس وقت اس کے والد میاں خان اپنی بیوی کے ساتھ کسی غرض سے گجرات گئے، جو تقسیم کے بعد پاکستان کے حصے میں آ گیا۔ جانے سے پہلے انھوں نے اپنے بیٹے رحمت اللہ اور اس کی بہن فاطمہ کو اپنے نانا کے یہاں چھوڑ دیا تھا۔ تقسیم کی شدید ہنگامہ آرائی کی وجہ سے وہ دوبارہ ہندستان نہ لوٹ سکے۔ اور وہیں بدین شہر میں سکونت اختیار کر لی۔ رحمت اللہ کا جنم اسی دھرتی پر ہوا۔ بعد میں عرفان نامی ایک لکڑی کے تاجر جو کراچی کا رہنے والا تھا اور بھارت میں جس کی شادی ہوئی تھی، کی وجہ سے پتہ چلا کہ میاں خان کا خاندان بدین میں آباد ہے۔ اس کے بعد فون اور انٹرنیٹ کے ذریعے دونوں بھائیوں نے رابطہ کیا۔ لیکن ویزا فراہم نہ ہونے کی وجہ سے دونوں بھائی سرحدوں کو عبور کر کے ایک دوسرے کا دکھ درد نہ بانٹ سکے۔ بعد میں احمد نور نے اپنے بھائی کے ساتھ عید منائی اس طرح 63 سال بعد ایک خاندان نے اپنے بکھرے ہوئے افراد سے مل کر خدا کا شکر ادا کیا۔

ہجرت سے پیدا شدہ خانگی زندگی کے بکھراؤ کی عکاسی اردو افسانہ نگاروں نے آزادی کے بعد پہلے دہے میں کثرت سے کی ہے۔ ان کے افسانوں میں ضمنی طور پر یا براہ راست تقسیم ہند اور ہجرت سے دونوں ملکوں میں پیدا شدہ صورت حال، متروکہ جائداد کا مسئلہ، دونوں ملکوں کے خاندانوں کے عزیزوں کا ایک سے دوسرے ملک میں حلول کر جانا، اپنی جگہ پر رہ جانے والوں کی دشواریوں اور معاشی کمزوری وغیرہ کے نمونے ملتے ہیں۔ اس کائنات کا ہر ذرہ اور اس کی ہر حقیقت مسلسل تبدیلیوں سے گزرتی رہتی ہے لیکن ان تبدیلیوں میں ہمیشہ ایک قسم کا نظم وضبط پایا جاتا ہے یعنی ارتقا کی بنیادی چیز تبدیلی ہے لیکن ارتقائی تبدیلیوں کا انحصار سماجیاتی حالات کے تقاضوں اور افراد کے ردعمل کے نتیجہ پر ہوتا ہے یہ ردعمل کبھی مثبت ہوتا ہے کبھی منفی۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وقتی طور پر ارتقاء میں تعطل نظر نہیں آتا ہے۔ لیکن درحقیقت تعطل کی حرکت پذیری قائم رہتی ہے۔ آزادی کے بعد تغیرات کی رفتار کی کوئی جہت متعین نہیں تھی اس وجہ سے قدروں اور روایتوں کی پامالی، اور انسانیت کی ناقدری سے فرد کے دلوں میں اضطراب اور ذہنوں میں جمود کی کیفیت طاری تھی۔ آج اکیسویں صدی میں بھی غارت گری کے مسائل کم نہیں، بس فرق یہ ہے کہ اس وقت کا ذہن ان چیزوں سے نامانوس تھا، ان میں احساسات وجذبات قوی تھے۔ آج کا انسانی ذہن ان المیاتی وسانحاتی تکرار کا عادی ہو گیا ہے، انسان کے ہاتھوں ہوئے انسانیت کے قتل سے اجتماعی تعاون کا یقین پژمردہ ہو گیا ہے۔ مذہب کی آڑ لے کر مذہب کے خلاف ہونے والے کارناموں نے ان کے مذہبی عقیدے کو متزلزل کر دیا ہے اپنوں کے ہاتھوں بار بار استحصال ہونے کی وجہ سے قرابت داری اور رشتوں کی اہمیت ان کے دلوں سے جاتی رہی ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ

آج کا انسان ضرورتوں میں پوری طرح اپنے آپ کو مقید کر رکھا ہے زندگی میں ایسے پہیئے لگا لئے ہیں کہ بھاگ دوڑ ان کا مقدر بن گیا۔ آزادی کے بعد خانگی زندگی میں تبدیلی کی ایک بڑی وجہ صنعتی انقلاب ہے جس نے جدید قسم کی صنعت کی بنیادیں قائم کی، اور پیداوار کے نظام میں نئے نئے طریقے اپنائے۔ نئی مشینوں کی ایجاد اور توانائی کے نئے وسائل کے استعمال سے پیداوار کے نظام میں تبدیلیاں آئیں اور ان تبدیلیوں کی وجہ سے سماجی اور خانگی زندگی میں تغیرات آنے شروع ہوئے، دیہی علاقوں سے مزدور گھر بار چھوڑ کر کام کی تلاش میں شہروں کی طرف آنے لگے، اور کم اجرت پر فیکٹریوں میں کام کرنے لگے، کم اجرت کی وجہ سے مرد کے ساتھ عورتیں یہاں تک کہ بچوں کو بھی گھنٹوں خطرناک حالات میں روزی کمانے کے لئے کاموں میں لگنا پڑا۔

صنعتی انقلاب کے ساتھ ہی زرعی پیداوار کے اضافے اور کارخانوں کی مصنوعات کی پیداوار کی بڑھوتری میں مقابلہ شروع ہو گیا، زمینی ذخیروں جنگلوں کی لکڑیوں، توانائی کے ذرائع اور زمین کے خطہ کی اگانے کی قوت کو بری طرح انسانی لالچ کے لئے استعمال کیا جانے لگا بیسویں صدی کی پانچویں دہائی تک آبادی کے بے تحاشا بڑھنے سے ضرورتیں بڑھنے لگیں اور ہر قسم کی پیداوار میں اضافہ ہوا، لیکن قدرتی وسائل میں کمی ہونے لگی۔ صارفیت کو بڑھاوا ملا سیدھا سادھا طرز زندگی پیچھے چھوٹنے لگا پیداوار بڑھانے کی اندھی دوڑ میں فطرت کا نظام لڑکھڑانے لگا ماحولیاتی عدم توازن بڑھنے لگا لیکن صنعتی معاشرے کا مزہ چکھنے کے بعد قبائلی، دیہاتی یا خانگی سماج میں لوٹنا بہت دشوار تھا۔

زرعی دور کے روایتی خاندان کے برعکس صنعتی دور کے سماج اور خاندان کا ماحول اور اس کے مسائل بہت مختلف ہیں، آج کا فرد خاندانی، موروثی یا ثقافتی بنیادوں پر منحصر نہیں ہوتا بلکہ اس کا انحصار status اور arts پر ہوتا ہے، اور اسی وجہ جدید دور کا انسان محض اپنی نجی زندگی تک سمٹ گیا ہے، ہندوستان میں نیوکلئر فیملی کا تصور صنعتی دور کی دین ہے، اگر چہ اس کی ہیئت وساخت بہت پرانی ہے، مگر قومی سطح پر اس کا تصور اور اس کی طرف لوگوں کا شعوری رجحان جدید دور کا پروردہ ہے۔

اردو زبان کے افسانہ نگاروں نے ہجرت سے پیدا شدہ خانگی زندگی کے بکھراؤ اور صنعتی انقلاب کے نتیجے میں ابھرنے والے نیوکلئر فیملی کے تصور، رجحان اور اس کے مسائل کو علامتی اور حقیقت نگاری دونوں پیرایوں میں فنی لوازمات وانسلاکات کے ساتھ بحسن وخوبی بیان کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں موضوعاتی تنوع ضرور ہے مگر وہ بنیادی طور پر اس مشترکہ تہذیب اور ہندوستانی خاندان کے نظم وضبط کی قصہ گوئی کرتی ہیں جو عہد بہ عہد ہندوستان میں ترقی پائی تھی اور جس کو زمانے کی الم ناکیوں نے متعدد بار بکھیر دیا تھا۔ تقسیم ہند بھی ان ہولناکیوں میں سے ایک ہے جس سے وہ ذاتی طور پر بے حد متاثر ہوئی تھیں۔

ان کی نظر میں ہندوستانی سماج، خاندان، اور فرد ایسے نظام سے وابستگی کا نام ہے جس میں تہذیب وروایت کی اعلیٰ قدریں ہوں، جو احساسات وجذبات کے مثبت رویے کا پیکر ہو اور جس کے اندر اخلاقی وتادیبی جوہر ہوں۔ ہجرت

کے موضوعات پر لکھے گئے ان کے افسانوں میں خاندان اور اس کی تہذیبی تشخیص کا معاملہ اہمیت کا حامل ہے۔

''ہاؤسنگ سوسائٹی'' قرۃ العین حیدر کا طویل افسانہ ہے جس میں تقسیم ہند سے قبل اور بعد کی صورت حال کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ اس میں مرزا صاحب اور منور علی شاہ کے دو خاندانوں میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر ہے۔

تقسیم ہند سے قبل اودھ کے مختلف اضلاع میں متوسط اور اعلی خاندان جو ایک روایتی اصول سے ہٹ کر مغربی طرز معاشرت کو اپنا رہا تھا اس کو مرزا صاحب کے خاندان کے پس منظر میں بیان کیا گیا ہے۔ مرزا کا خاندان مرزا ان کی ترقی یافتہ اور مغربی تہذیب کی دالدادہ بیوی، بیٹے سلمان مرزا اور امیرانہ ناز و اندام میں پلی ان کی بیٹی سلمی مرزا پر مشتمل ہے، دوسرا منور علی شاہ، ان کے دو بھائیوں اور ایک بھتیجہ جمشید پر مشتمل خاندان ہے، اس خاندان میں ہند ایرانی طرز زندگی، ہندو مسلم تہذیبی روایت کے چربے کی جھلک جا بہ جا دکھائی دیتے ہے، لیکن انگریزی تہذیب کی واضح چھاپ بھی نمایاں ہیں، ان خاندانوں میں اتنے تنوع ہیں کہ اس عہد کے ہندوستان کی پوری تاریخ اس سے وابستہ معلوم ہوتی ہے۔ اس میں مرزا صاحب، ان کی بیوی اور بیٹی میں مغربی تہذیب کی جھلکیاں، اسی خاندان کے ایک کردار سلمان کے ذریعے کمیونسٹ پارٹی کے بڑھتے رجحان کو دکھایا گیا ہے۔ شاہ منور علی کا خاندان ہند ایرانی تہذیب کا حامل ہے۔ اس میں تبدیلیوں کا عمل جاری ہے۔ جمشید کے ذریعے اس وقت کے مسائل، طلاق، اقتصادی فراغت، عیاشی اور آزادانہ روش کو بیان کیا گیا ہے۔ تعلیمی بیداری اور معاشی ترقی کی خاطر مقابلے کی ریس میں ثریا کی کردار سازی کی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہجرت کی المناکیوں کا بھی ذکر ہے۔

> ''گلیوں میں مہاجر چل پھر رہے تھے، روزانہ کھوکھراپار عبور کر کے راجستھان، دلی اور یوپی کا ایک نیا پریشان حال قافلہ ان محلوں میں چھاونی چھاتا کیسی کیسی مصیبتیں اٹھا کر لوگ ہندستان سے نکلے تھے، اور یہاں ان کو کیسی کیسی مصیبتیں اٹھانا تھیں۔''(۴)

غرض کہ اس افسانے میں سبھی کرداروں کے ذریعے اس دور کی موجودہ صورت حال اور ہجرت سے دوچار انسانیت کو بیان کیا گیا ہے جو خانگی زندگی اور تہذیبی حوالگی سے محروم ہو کر اپنی شناخت کھو چکے تھے۔ اسی کے ساتھ اس میں ضمنی موضوعات بھی ہیں جن کے تحت زمیندارانہ اور جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ، تہذیبی بکھراؤ، مختلف خاندانوں کے افراد کی مہاجرانہ صورت اور رہن سہن کے جدید طریقوں کو پیش کیا گیا ہے، مجموعی طور پر ان کا یہ افسانہ شہاجی اور خانگی زندگی کی تبدیلیوں کی مختلف جہات کا بخوبی احاطہ کرتا ہے۔

''جلاوطن'' قرۃ العین حیدر کا ایک طویل افسانہ ہے اس میں بھی انھوں نے تقسیم اور فسادات سے ابھرنے والے مختلف النوع مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ خاص کر ہجرت کرنے اور نہ کرنے کی کش مکش، مشترکہ خاندان کے بٹوارے اور تحریک آزادی کے آخری دور میں ہندو مسلم نفاق کی جھلکیاں اس میں ہیں۔ اس افسانے کے کردار اودھ کے علاقے

سے تعلق رکھتے ہیں۔ جہاں تقسیم ہند سے قبل کی خانگی، تہذیبی اور مذہبی رواداری کی ایک مستحکم مثال قائم تھی، لیکن تقسیم ہند کے بعد اس میں یکسر تبدیلی آئی۔ مذہبی عصبیت زور پکڑنے لگی۔ مسلمانوں کی خانگی زندگی میں ابتری آئی اور ہر خاندان سے متعدد افراد ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ جس سے نہ صرف مشترکہ تہذیب مٹنے لگی، بلکہ خاندان کی صورت حال بھی دگرگوں ہوگئی۔ اب نہ تو محلوں میں وہ رونق تھی اور نہ ہی تہواروں اور خوشی کے موقعوں سے لوگوں کی دل چسپیاں۔

> ''آج چاند رات تھی۔ محلے میں نقارہ رکھا جا چکا تھا۔ مجلسیں اب بھی ہوتیں۔ لیکن وہ چہل پہل، رونق اور بے فکری تو کب کی خواب وخیال ہو چکی تھی۔ ڈیوڑھی میں ڈولیاں اترنی شروع ہوئیں اور بیویاں آ آ کر امام باڑے کے دالان میں بیٹھنے لگیں۔ کشوری بے دلی سے دہلیز پر اپنی پرانی جگہ پر بیٹھی رہی۔ دالان کی چاندنی جس پر تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی تھی، اب چھدری چھدری نظر آتی تھی۔ سارے خاندانوں میں سے دو دو تین تین آدمی تو ضرور ہی ہجرت کر گئے تھے۔... چھمو بیگم چپ چاپ آ کر میز کے پاس کھڑی ہوگئی، زیارت پڑھ کر تعزیوں کو جھک کر سلام کرنے اور کنپٹیوں پر انگلیاں چٹخا کر جناب علی اصغر کے سبز جارجٹ کے گہوارے کی بلائیں لینے کے بعد انھوں نے علموں کو مخاطب کر کے آہستہ سے کہا مولا یہ میرا آخری محرم ہے۔ ارے اب میں تمھاری مجلسیں یہاں کیسے کروں گی اور یہ کہہ کر انھوں نے زور شور سے رونا شروع کر دیا۔''(۵)

اس کے علاوہ جاگیردارانہ فیملی کی مٹتی ہوئی تہذیب ٹوٹتی بکھرتی زندگی، شہری اور دیہاتی زندگی کے باہمی امتزاج سے ایک نئی سماج و معاشرت کا قیام اور خانگی زندگی کے بکھرتے نظام ان موضوعات پر قرۃ العین حیدر نے بہت سے افسانے لکھے ہیں جن میں، ''باوسنگ سوسائٹی''، ''حسب ونسب''، ''گلستاں سے قبرستان تک''، ''دریں گردد شوائے باشد''، ''شیشے کا گھر''، ''برف باری سے پہلے''، ''کیکٹس لینڈ''، ''جلاوطن''۔ اس کے علاوہ 'داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر' 'آوارہ گرد' 'محفوظات حاجی گل بابا بیکتاشی' اور 'یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے' ایسے افسانے ہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ تقسیم ہند، فسادات، ہجرت اور مہاجروں کی صورت حال جیسے اہم موضوعات کو پیش کرتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں سماج کے اعلیٰ اور متوسط طبقے کی زندگی کے نمونے بہت ملتے ہیں۔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب خاندان کے بکھراؤ اودھ کے ہندو مسلم کلچر کے زوال ان کے افسانوں کے خاص موضوعات ہیں۔ تقسیم ہند سے پہلے ہندوستان میں ایک گنگا جمنی تہذیب پائی جاتی تھی یعنی ہند اسلامی کلچر جس کے روح رواں مسلمان زمین دار اور جاگیردار تھے خصوصاً اودھ اور عموماً پورے اتر پردیش کی گلی گلی میں اس تہذیب کی دھاک بیٹھی تھی۔ اس کا

مظاہرہ تہواروں اور محرم میں خاص طور پر ہوا کرتا تھا لیکن تقسیم نے اس تہذیب اور کلچر کا شیرازہ بکھیر دیا۔ زمین داری ختم ہوگئی مسلمانوں کو نئے ملک میں مہاجر بن کر جانا پڑا اور جو نہیں گئے وہ بھی جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئے۔ پرانی روایتیں قدریں سب کی سب بدل گئیں۔ اعلی ادنی ہوگیا اور ادنی اعلی، نوکر آقا اور آقا نوکر، تہذیبی زوال اور سقوط زمین داری قرۃ العین کے خاص موضوع ہیں۔ ان کے تقریباً تمام افسانوں میں اسی المیہ پر آنسو بہائے گئے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے افسانوں کے تجزیاتی مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے تقسیم ہند اور فسادات کے جتنے بھی افسانے لکھے ہیں ان میں ہندوستان کی تہذیبی زوال کا کرب بہت شدت سے محسوس ہوتا ہے وہ اس بات پر زیادہ زور دیتی ہیں کہ اس واقعہ کے اثرات نہ صرف ملک، سماج اور معاشرہ جیسے اہم اداروں پر ہی مرتب ہوتے ہیں۔ بلکہ خاندان کی اکائی خاص کر ہجرت کی وجہ سے بہت عنصر ثابت ہوئی اور ان میں بھی وہ خاندان جن کے کچھ افراد ہجرت کر گئے اور کچھ نے اپنے آبائی وطن میں ہی سکونت کو ترجیح دی۔ غرض کہ انہوں نے ہجرت کی وجہ سے منقسم خاندانوں کی اس ہیئت کو بھی اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے جن کے افراد ہندو پاک کے علاوہ دیگر ممالک میں ایک نئے خاندان کی روایت کی بنیاد ڈال کر خوشحالی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی زندگی میں وطن سے دوری اور رشتہ داروں سے بچھڑنے کے شدید غم پائے جاتے ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی نے آزادی سے قبل ہی اردو افسانوں کے مختلف موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔ لیکن آزادی کے بعد حالات میں تبدیلیاں آئیں تو انھوں نے بھی نئے موضوعات اور نئے رنگ سے اپنے افسانوں کو ہم آہنگ کیا۔ ان میں ہجرت، فسادات سے پیدا ہونے والے حالات و مسائل مہاجرین کی پناہ گزینی اور بازآبادکاری کی دردناک زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔ عورتوں کا اغوا اور پھر ان اغوا شدہ عورتوں کے بسنے اور بسانے کے مسائل ان کے جنسی استحصال کی داستان اور تقسیم ملک کے باعث ٹوٹے اور بچھڑے ہوے خاندان وغیرہ ان کے اہم موضوعات ہے۔ بیدی کا افسانہ لاجونتی میں انھوں نے عورتوں کے اغوا اور ان کے بسنے بسانے کے مسائل کو فنی لوازمات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس میں انھوں نے اگر چہ براہ راست فسادات کی غارت گری اور اس سے پیدا ہونے والے انتشار کو بیان نہیں کیا ہے، بلکہ یہ ظاہری طور یہ ایک نفسیاتی افسانہ جو لاجونتی اور سندر لال کی ازدواجی زندگی کے نشیب و فراز پر مشتمل ہے۔ لیکن اس کے پس منظر میں تقسیم، ہجرت اور فسادات کی جھلکیاں بخوبی دکھائی دیتی ہیں۔ انہوں نے آزادی سے قبل کی ان کی ازدواجی زندگی کی تلخیوں کو اجاگر کیا ہے، ساتھ ہی اس میں پنپنے والی محبت اور اس کی خوشگواری کو بھی بیان کیا ہے۔ جب کہ آزادی کے بعد ازدواجی زندگی کی یہ صورت بالکل بدل جاتی ہے۔ اس طور پر کہ سندر لال جو پہلے شرابی تھا شراب کے نشے میں اپنی بیوی پر ہمیشہ ظلم کیا کرتا تھا۔ اب اس وجہ سے اس سے اچھے سے پیش آتا ہے تا کہ لاجو کو یہ پتہ نہ چلے کہ اغوا ہونے کی وجہ سے میرے ساتھ ظلم ہو رہا ہے۔ سندر لال کے دل میں لاجونتی کے تئیں شبہات تو ہوتے ہیں لیکن وہ اظہار اس لیے نہیں کرتا کہ لاجونتی کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے۔ بیدی نے اس افسانے میں اس مذہب کی آڑ لے کر ان مغویہ عورتوں

کو اپنانے سے انکار کرنے والے اس سماج کی بھی شدت سے مخالفت کی ہے اور لاجونتی کو بسا کر لوگوں کے سامنے ایک مثال پیش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ان بیچاری عورتوں کے اغوا ہو جانے میں ان کا کوئی قصور نہیں، فسادیوں کی ہوسنا کیوں کی شکار ہو جانے میں ان کی کوئی غلطی نہیں۔ وہ سماج جو ان معصوم اور بے قصور عورتوں کو قبول نہیں کرتا، اپنا نہیں لیتا ایک جلا سڑا سماج ہے۔ اسے ختم کر دینا چاہیے۔''(۶)

اس اقتباس کے ذریعے بیدی نے اس دور کی اغوا کاری کی شرح اور خاندان کے بکھرنے اور ازدواجی زندگی میں پڑنے والے شگاف کی شدت سے نشان دہی ہے۔ اس افسانے میں ان کی تلقین کا یہ رجحان اس دور کی دردنا کی کو بحسن وخوبی واضح کرتا ہے۔ وقار عظیم لکھتے ہیں۔

''بیدی نے اس افسانے کے ذریعے لوگوں کو بتایا ہے کہ موجودہ انقلاب سے جسم اتنے زیادہ زخمی نہیں ہوے جتنے دل۔ اس لیے ہم (جس میں عام انسانوں کی طرح فنکار بھی شامل ہیں۔) انھیں زخموں کا مداوا کر کے اپنی معاشرتی زندگی کو ناسور بنانے سے روک سکتے ہیں۔''(۷)

اس افسانے کے ذریعے بیدی نے جسم اور روح کے زخم کے درمیان فرق کو نفسیاتی پیرایے میں بیان کیا ہے۔ اور لوگوں کو یہ درس دیا ہے کہ قتل وخون کے اثرات تو ذہنوں سے زائل ہوتے رہتے ہیں مگر جب روح زخمی ہوتی ہے تو پوری زندگی بلکہ پوری نسل ذہنی اضطراب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی راجندر سنگھ بیدی کے کئی افسانے ایسے ہیں جن میں ہجرت سے پیدا شدہ خاندان اور معاشرت کے بکھراؤ کو حقیقت نگاری کے پیرایے میں بیان کیا گیا ہے۔

کرشن چندر ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے آزادی کے بعد کے افسانوں میں مجموعی طور پر تقسیم ہند، آزادی اور فسادات جیسے اہم موضوعات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ یوں تو انہوں نے ہندوستان کی سماجی ومعاشی پست حالی عشق ومحبت، سیاسی جدوجہد، مذہبی کھوکھلا پن اور خانگی زندگی کی پیچیدگیوں کا ہر پہلو سے بغور مشاہدہ کیا ہے اور پھر ان کو موضوعات کے طور پر منتخب کر کے افسانوں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ لیکن چوں کہ ہمارے موضوع کا تعلق تقسیم ہند اور فسادات میں منتشر ان خاندانوں کے جائزے سے ہے جو کبھی مشترکہ خاندانی نظام کے تحت زندگی گزار رہے تھے اور اپنی تہذیبی وروایتی طرز حیات سے منسلک تھے لیکن فسادات اور تقسیم ہند نے انہیں یا تو ہجرت پر مجبور کر کے جداگانہ نوعیت کے خاندانی نظام اور اجنبی تہذیب وروایت کی کشمکش میں مبتلا کر دیا، قتل وغارت گری نے جنگ میں پوری طرح اسے تہہ تیغ کر ڈالا یا اگر اتفاق سے کچھ افراد بچے بھی تو کسم پرسی کے عالم میں سماج اور خاندان کے نظام سے الگ، بدتر زندگی گزارنے پر انہیں مجبور ہونا پڑا۔

کرشن چندر کا افسانہ، پشاور ایکسپریس ایک طوائف کا خط، امرتسر آزادی سے پہلے اور امرتسر آزادی کے بعد جانور، دوسری موت، لال باغ، جیکسن وغیرہ انہیں موضوعات پر مشتمل ہیں۔

پشاور ایکسپریس: اس افسانہ میں کرشن چندر نے ٹرین کی زبانی سرحد کے دونوں اطراف کے فسادزدہ ماحول اور اس کی تباہ کاریوں اور بربادیوں کا عمدہ طریقے سے ذکر کیا ہے بظاہر اس میں خاندان اور اس کی ہیئت کے بکھراؤ کا کوئی نمونہ واضح طور پر نہیں ملتا مگر لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے پس منظر میں ایسے افراد کی کہانی ضرور ملتی ہے جو کسی نہ کسی سماج اور خاندان کا پروردہ تھے، اس سانحہ نے اتنی جانیں لیں کہ کنبہ کا کنبہ صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ گھر کا گھر اجڑ گیا، مال و جائداد لٹ گئے۔ وہ خاندان جو اپنی پوری جماعت کے ساتھ نقل مکانی کر رہا تھا اپنی زمین و جائداد کو خیر آباد کر کے نئے تمناؤں کو پوری کرنے کے غرض سے ہجرت کر رہا تھا اس کے ساتھ کیا کیا معاملات درپیش آئے کرشن چندر نے افسانے کے پس منظر میں اس کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

افسانہ جانور:۔ اس میں کرشن چندر نے ایسے ہی آدمی نما جانوروں کو کہانی کا روپ دیا ہے، سکھ، ہندو اور مسلمان کے بہیمانہ سلوک کی بڑی مکروہ مثالیں اس افسانے میں موجود ہیں۔ تین کردار تین واقعہ سناتے ہیں جو فرقہ وارانہ فساد کے وحشی پن کو ظاہر کرتے ہیں۔ دیس راج کوٹلی، سردار سوڈھا سنگھ اور احمد حمید تینوں کا فرقہ وارانہ فساد میں سب کچھ برباد ہو چکا ہے۔ راج کے بہنوئی کی تو لاش تک نہیں ملی۔ بیوی، بچے اور بوڑھے باپ کے ساتھ اپنی پشتینی مقام کو خیر آباد کہہ کے بھی اپنے اکلوتے بیٹے کو نہ بچا سکا اور نہ ہی اپنے باپ کے رشتے کو جذباتی طور پر قبول کر سکا حمید کے قتل کا منظر بھی مشترکہ تہذیب اور مشترکہ خاندانی نظام کے اقدار کو بخوبی اجاگر کرتا ہے۔

> ''حمید نے مرتے ہوئے رنجیت کی طرف دیکھ کر کہا'' اچھا بھائی کوئی بھول چوک ہوئی ہو تو معاف کر دینا'' رنجیت نے جواب دیئے بغیر اس کا سر قلم کر دیا''۔(۸)

حمید کا اس طرح سے موت کی خوفناکی میں بھی اخلاقی اقدار پر قائم رہنا ہندوستانی سماج و خاندان کی اعلیٰ قدروں سے وابستگی کا اظہار ہے۔ فسادات نے خاندانی نظام کے انہیں سب اخلاقی اور تہذیبی قدروں کو پامال کرنے کے ساتھ ساتھ اس میں انتشار اور بکھراؤ کی صورت پیدا کی ہے۔

ایک طوائف کا خط: اس میں کرشن چندر نے ہندو مسلم فساد کو ''بیلا'' اور ''بتول'' دو لڑکیوں کے کردار کے ذریعہ بیان کیا ہے یہ دونوں راولپنڈی اور لدھیانہ کے دو ہندو اور مسلم گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن فساد نے ان گھرانوں کو اپنے چنگل میں لے کر اس طرح برباد کر دیا ہے کہ ان گھرانوں سے تعلق رکھنے والی لڑکیاں چکلے کے دلالوں کا شکار ہو جاتی ہیں۔ کرشن چندر نے خاندان کے بجھتے چراغوں کا کتنا دردانگیز منظر کھینچا ہے۔

> ''اس کے باپ کو جاٹوں نے اس بے دردی سے مارا ہے کہ ہندو

تہذیب کے پچھلے چھ ہزار سال کے چھلکے اتر گئے ہیں اور انسان کی بربریت
اپنے وحشی ننگے روپ میں سب کے سامنے آ گئی ہے پہلے تو جانوں نے اس
کی آنکھیں نکال لیں پھر اس کے منہ میں پیشاب کیا پھر اس کے گلے کو چیر کر
اس کی آنتیں نکال لیں۔ پھر اس کی شادی شدہ بیٹیوں سے زبردستی منہ کالا کیا
،اسی وقت اس کے باپ کی لاش کے سامنے، ریحانہ، گل، درخشاں، مرجانہ،
سوسن، بیگم ایک ایک کر کے وحشی انسان نے اپنے مندر کی مورتیوں کو ناپاک
کیا جس نے انہیں زندگی عطا کی۔ جس نے انہیں لوریاں سنائی تھیں۔ جس
نے ان کے سامنے شرم سے عاجزی اور پاکیزگی سے سر جھکایا تھا''۔(۹)

اسی طرح انہوں نے ''بیلا'' کے خاندان کے تمام افراد کے قتل کا بیان بھی دردناک انداز میں کیا ہے۔'بیلا' اور 'بتول' کی یہ کہانی صرف دو خاندانوں تک محدود نہیں بلکہ دو مذہب دو تہذیب اور دو قوم کے خاندانوں پر محیط ہے، جس میں خاندان کی ہیئت، ساخت کی ہر قسمیں تباہ و برباد ہوئیں۔ غرض کہ ایک طوائف کا خط نامہ نگاری کے پیرائے میں لکھا ہوا ایک ایسا افسانہ ہے جو فرقہ پرستی کے بھیانک واقعات کے پس منظر میں خانگی زندگی کے بکھراؤ اور انسانیت سوزی کے واقعات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

امرتسر آزادی سے پہلے اور امرتسر آزادی کے بعد: یہ افسانہ صرف ایک شہر کی آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد کی منظر کشی پر مبنی نہیں ہے بلکہ کرشن چندر نے امرتسر کو علامت کے طور پر استعمال کر کے پورے ہندوستان کی سماجی، معاشرتی اور خانگی ہم آہنگی اور قومی یک جہتی و مشترکہ روایتی اقدار کے عروج و زوال کی تصویر کشی کی ہے۔ امرتسر ایک ایسا شہر ہے جس سے جلیان والا باغ کا اہم واقعہ جڑا ہے جس میں ہندو مسلمان اور سکھ مشترکہ خاندان کے تحفظ کی خاطر اجتماعی طور پر اپنی جانوں کی قربانیاں پیش کی تھیں۔ لیکن آزادی کے بعد یہی شہر فسادات کی لپٹ میں اس طرح آیا کہ سماجی اور خانگی تحفظ کے سارے بندھن یک لخت پاش پاش ہو گئے اور ہندوستان کے بے شمار ہندو مسلم اور سکھ خاندانوں کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ فرقہ واریت نے اس سرزمین کے خانگی زندگی کے اقدار یعنی شرافت، تقدس، نیکی، اخلاقی اور باہمی بھائی چارگی کے نام و نشان کو مٹا دیا۔ اس کے علاوہ کرشن چندر کے اور بھی متعدد افسانے ہیں مثلاً ''دوسری موت''، ''لال باغ''، ''اور جیکسن'' جن میں انہوں نے فسادات کے پس منظر میں خانگی زندگی کے بکھراؤ اور انتشار کے عمدہ نمونے پیش کئے ہیں۔

عصمت چغتائی مسلم معاشرہ اور خاندان کے بیگماتی مسائل اور پیچیدگیوں کو انہیں کی شیریں اور تلخ زبان میں بیان کرتی ہیں اور ان کی بغاوت اور طنز آمیز جملوں سے اپنے انوکھے اسلوب کی بنیاد ڈالتی ہیں اور یہ انہیں کا خاصہ ہے۔

عصمت کے افسانوں میں بکھراؤ اور عروج و زوال کے عناصر کی کارفرمائی شروع سے ہی رہی ہے ابتداء

انہوں نے جاگیرداری، زمین داری اور دیگر سماجی اور معاشرتی نظام کے نشیب وفراز اور شکست وریخت کی کہانیاں لکھی ہیں اس کے بعد تقسیم ہند اور فسادات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے قومی اور تہذیبی مدوجزر کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ فرقہ واریت کے موضوع پر لکھے گئے عصمت کے افسانوں میں سے ''میرا بچہ''، ''ہندوستان چھوڑ دو'' ''میں چپ رہا'' اور ''جڑیں'' ایسے عمدہ افسانے ہیں جن میں کسی نہ کسی طور پر فسادات، تقسیم ہند اور ہجرت کے موضوع شامل ہیں اور جس کے پس منظر میں گھروں کے اجڑنے اور بسنے کی داستان بھی مضمر ہے۔

میرا بچہ: اس افسانہ میں مذہبی تاثر کے زیر اثر فرقہ واریت کی اٹھتی ہوئی لہر کا بیان ہے جس کے اثرات مذہب اور سماج کی اعلیٰ سطح سے لیکر ذیلی سطح کے فرد پر مرتب ہوتا ہے۔ اس افسانہ میں رشید کا کردار قومی یک جہتی اور خانگی نظام کے اقدار سے آراستہ اہم کردار ہے جو مذہب، ذات، پات، فرقہ اور جماعت بندی سے بالاتر ہو کر ایک ایسے بچے کی پرورش کرتا ہے جس کے خاندان کا وجود فساد میں مٹ جاتا ہے لیکن کسی کو بھی اس صورت حال میں بچے کی کفالت کا خیال نہیں رہتا لیکن وہی بچہ جب رشید کی کفالت میں آتا ہے تو اس کے مذہب کے تحفظ کی خاطر فرقہ واریت کی گھناؤنی سیاست شروع ہوتی ہے جس کا انجام فساد کی صورت میں عیاں ہوتا ہے۔

> ''پیپل کا ایک شریر گدا عین سڑک پر جھک آیا اور جب قد آور
> تعزیوں نے ادھر سے چہل قدمی کی کوشش کی تو جھکنے کی ضرورت پڑی۔
> تعزیے اور جھکیں! اور گدا، اور وہ بھی پیپل کا! توبہ کیجئے اسی طرح ڈٹا رہا۔ نتیجۃً
> سیکڑوں گھر لٹ گئے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے گھر پھونک دئے۔
> مسلمانوں نے ہندوؤں کو کاٹ کر رکھ دیا''۔(۱۰)

جڑیں:۔ اس افسانہ کے توسط سے عصمت چغتائی نے فساد اور تقسیم ہند کے اثرات کو نمایاں کیا ہے۔ یہ اثرات ہندو مسلم دو گھرانوں پر ہی نہیں بلکہ دو معاشرے پر کس طرح مرتب ہوئے اس کی مثال دیگر افسانوں میں اتنی شدت سے موجود نہیں تقسیم ہند کے واقعہ سے دو خاندان جو قومیت اور مذہب کے اعتبار سے مختلف تھے، دھیرے دھیرے ان میں کس طرح دوری پیدا ہوئی اور تقسیم کے بعد فسادات کے خوف نے مسلم خاندان کو کس طرح ٹوٹنے پر آمادہ کیا اس کی مکمل جھلکیاں اس میں ابھر کر سامنے آئی ہیں۔ اماں کا کردار مشترکہ خاندانی نظام کا ایک اہم نمونہ ہے جو کسی بھی صورت میں خاندانی مقام سے علاحدگی پر رضا مند نہیں جب کہ خاندان کے دیگر افراد اور اس سے وابستہ رشتے دار ہجرت پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور گھر بار یہاں تک کہ ماں جیسی عظیم دولت کو ٹھکرا کر پاکستان کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن عصمت چغتائی قومی یک جہتی، روایتی اقدار خانگی بکھراؤ کے مشاہدے کی قوت نہیں رکھتی، یہی وجہ ہے کہ وہ آخری وقت میں یہ فیصلہ لیتی ہے کہ سماج اور خاندان بکھرنے سے محفوظ رہے اس کے لئے کہانی کے آخری حصے میں وہ روپ چند کے روایتی جذبوں میں روح ڈالتی ہیں اور دونوں خاندانوں کی سوئی ہوئی محبت بیدار کر کے خانگی اور

معاشرتی نظام کی شیرازہ بندی کا بحسن خوبی التزام کرتی ہیں۔

عصمت چغتائی نے ہجرت اور اس سے پیدا شدہ کوائف و مسائل کو بہت واضح پس منظر میں بیان کیا ہے، ''جڑیں'' کے علاوہ ان کے دیگر افسانوں سے سماجی شعور، اور خانگی زندگی سے بکھراؤ کی کیفیت کی آگہی براہ راست پیدا نہیں ہوتی لیکن اگر اس دور کے افراد و خاندان کے اقدار و افکار اور احساسات و جذبات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے افسانوی تخلیقات کا مطالعہ کیا جائے تو بالواسطہ طور پر خاندان اور سماج کی بکھراؤ کی صورت حال کا جائزہ بخوبی لیا جاسکتا ہے۔

آزادی، ہجرت، فساد اور تقسیم ہند کے بعد رونما ہونے والے واقعات اردو افسانہ نگاروں کے لئے وسیع موضوع فراہم کرتے ہیں۔ ہجرت اور فساد سے پیدا ہونے والے حالات و مسائل مہاجرین کی پناہ گیری اور دوبارہ آبادکاری کے انتظام ایسے مسائل ہیں جن کے پس منظر میں انسانی اضطراب اور خانگی زندگی میں بکھراؤ کے متعدد نمونے مضمر ہیں۔ حیات اللہ انصاری ان موضوعات پر لکھنے والوں میں ایک اہم افسانہ نگار ہیں انہوں نے ان حالات سے متاثر ہوکر بہت سارے افسانے تخلیق کئے ہیں۔ ان کا افسانہ ''ماں بیٹا'' فساد پر لکھا ہوا ایک اچھا افسانہ ہے اس میں انہوں نے دو معاشرے کی درندگی کو بہت واضح انداز میں اجاگر کیا ہے۔ مومنہ اور راموا س افسانے کے ایسے دو کردار ہیں جن میں ایک مسلم اور دوسرا ہندو ہے اور دونوں انسانی بربریت اور درندگی کے شکار ہوئے ہیں۔ اس افسانے میں حیات اللہ انصاری نے نفسیاتی اور جذباتی کشمکش کی آمیزش سے انسان کی اندرونی کیفیت کی صحیح عکاسی کی ہے۔ مومنہ جو کہ ہندوؤں کے ظلم و ستم کی شکار ہوئی بھاگ کر ایک ایسے گاؤں میں پناہ لیتی ہے جہاں ہندوؤں پر ستم ہوئے تھے اور اسی گاؤں کا ایک ستم زدہ بچہ خاک و خون میں تڑپ رہا تھا۔ افسانہ نگار نے یہاں ان دونوں کرداروں کے سب کچھ لٹنے اور خانگی زندگی کی بربادی کی بہترین عکاسی کی ہے۔ مومنہ جس کی بچی فساد میں بکھر گئی تھی اس کی یادوں کے سہارے اس کے دل میں ممتا کا پیار جاگتا ہے اور وہ بچے کو اپنا لیتی ہے۔ بچہ بھی جب بڑا ہوکر اپنی ماں کی اصلیت کو جانتا ہے تو اس کے دل میں اس کے لئے (مومنہ) سگی ماں سے بھی زیادہ پیار اور آرزو کے جذبات موجزن ہوجاتے ہیں۔ اس طرح اس افسانہ میں دونوں گھرانوں کی تباہی و بربادی کی نشاندہی کی گئی ہے اور انسان پر طنز کیا گیا ہے جنہوں نے انسان پر ہی اپنی مذہبی غلط اعتقادی کے باعث ظلم کئے ہیں اور خاندان و کنبہ کے پورے نظام کو درہم برہم کردیئے ہیں۔

شکر گزار آنکھیں:۔ یہ افسانہ بھی فسادات کے ذریعہ شوہر و بیوی کی محبت اور انسانی اقدار کی پامالی پر مبنی ہے۔ اس افسانہ میں شوہر اور بیوی ریل کے ذریعہ سفر کررہے ہوتے ہیں کہ اچانک فسادیوں کا غول ڈبہ میں داخل ہوکر لوٹ قتل اور عصمت دری کے جیسے برے افعال انجام دیتا ہے اور بالآخر میاں بیوی بھی ان کی زد میں آجاتے ہیں حیات اللہ انصاری نے اس میں عصمت کے تحفظ کی خاطر بیوی کی قربانی کو جس طرح پیش کیا ہے اس سے ہندوستان کی سماجی اور معاشرتی قدریں جہاں ابھر کر سامنے آتی ہیں وہیں سماج اور خاندان کے فرسودہ نظام کے تحت پروردہ، برے عناصر کی بھی قاتل کی صورت میں نشاندہی ہوتی ہے اس طرح حیات اللہ انصاری نے تقسیم ہند اور اس سے پیدا شدہ

فسادات سے متاثر سماج، خاندان اور فرد کی کشمکش اور اضطراب و انتشار کے جذبے کو فکر و فن کے بہترین اتصال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وقار عظیم لکھتے ہیں:

''ان دونوں افسانوں کی بنیاد تقسیم کے بعد ہونے والے ان
بہیمانہ واقعات کے تأثر پر ہے جن کے ذکر سے بھی روح کانپتی ہے، جی
تھرّاتا ہے۔''(۱۱)

ان کے افسانوں کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اس کے ذریعہ یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ کسی بھی حساس معاشرے میں انسانی قتل وخون کے حادثات اور ان کے ساتھ کی جانے والی ناانصافی اور زیادتیوں کا اثر بہرحال پورے سماج پر پڑتا ہے اور سماج کے تقریباً تمام شعبے اور گوشے اس سے متاثر ہوتے ہیں خاص کر خانگی اور اجتماعی زندگی کی بنیادیں پوری طرح متزلزل ہو جاتی ہیں۔

رتن سنگھ اپنی مختصر کہانیوں میں فرد اور سماج کے روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو بڑی خوبی سے بیان کرتے ہیں۔ ان کا افسانہ 'جنگل درس' ایک علامتی افسانہ ہے۔ اس میں ایک جنگل کی تصویر کشی کی گئی ہے جس میں انسان، حیوان اور پرندوں پر بھی خوش اسلوبی سے زندگی گذارتے ہیں۔ اچانک ان کی زندگی میں چیلوں کا خونی قہر ٹوٹ پڑتا ہے۔ اس میں جنگل ملک اور خاندان دونوں کی علامت ہے۔ ''تلاش ایک بال کی''۔ یہ بھی ایک علامتی افسانہ ہے جس میں ایک گریڑیا اور اس کے ریوڑ کے پس منظر میں بکھرے ہوئے خاندان اور اجڑی ہوئی بستی کا بیان ہے۔ اس کی کہانی یہ ہے کہ ایک بھیڑ کھنڈر میں پھنس جاتی ہے جب گریڑیا اس کو سنبھالنے کے لئے اس کی طرف جاتا ہے تو ادھر گلے کی ساری پوری بھیڑیں اس میں پھنس جاتی ہیں۔ یعنی تقسیم ہند کی ایک غلطی سے پوری نسل متاثر ہوتی ہے۔ دایوار، اس میں دو بھائیوں کے بٹوارے کو علامت کے طور پر استعمال کر کے تقسیم ہند کے مسائل اجاگر کئے ہیں۔

''لوک گیت کے آنسو''، ''دیوار'' کی ہی طرح اس افسانے میں بھی مصنف نے برصغیر ہندوستان کی ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کو یاد کیا ہے اسے دو بھائیوں کے ایک ایسے مشترکہ گھرانے سے تعبیر کیا ہے جس کا ایک بھائی ہندو ہے جس کا نام نہال چند اور دوسرا بھائی مسلم جس کا نام کمال دین ہے۔ یہ دونوں بھائی بڑے میل جول اور بڑے محبت سے رہے ہوئے ہیں۔ انہیں کی محبت میں یہ لوک گیت رچا گیا:۔

نہال چند گھر پتر جمنے
کمال دین گھر دیپ جلے
شالا: پیار بھراواں والا
دن دن دون ودھے

لیکن اس محبت کو آئندہ نسلیں قائم نہ رکھ سکیں اور آخر کار یہ ہوا کہ:

''حویلی کے بیچ و بیچ تقسیم کی دیوار کھینچی تو آنے جانے کے تمام
دروازوں پر بھاری قفل لگا دئے گئے۔ ساری کھڑکیاں بند کردی گئیں۔ جو
دروازے اور کھڑکیاں بند نہیں ہو سکتے تھے۔ وہاں کانٹے دار تاروں کے گھنے
جال بچھ گئے۔'' (۱۲)

اب بوڑھا پے میں بھی ''شالا پیار بھراواں'' والے گیت کے بول کبھی اس پار کی فضاؤں میں گونجتے ہیں۔ اور کبھی حویلی کے اس پار کے فضا میں۔ اور اس کے لوک گیت کے بول جب حویلی کے بیچ کھینچی کانٹوں کی تار سے سر ٹکرا کر زخمی ہو کر گذرتے ہوئے وقت کے دامن کو لہو کے چھینٹوں سے ناپاک کر دیتے ہیں۔ تو بوڑھی ہور ہی بیسویں صدی بے چین ہو اٹھتی ہے۔

ہندستان کی دو بڑی جماعتوں کے درمیان مذہبی سطح پر امتیاز کے باوجود تہذیبی سطح پر بے شمار اشتراک و امتزاج موجود تھے۔ تہذیبی سطح پر ہندستانی مسلمان عربی مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہندستانی ہندو کے قریب تھا۔ دونوں کے باہمی روابط بھی یادگار زمانہ رہے ہیں۔ لیکن چند سازشی اور شاطرانہ ذہن کے لوگوں نے اپنی حکمرانی کے نشہ میں چند امتیازات کو اتنا نمایاں کر دیئے کہ وہ ہماری باہمی آمیزشوں پر غالب آ گئے۔ اور پھر لوگ اپنی مشترکہ روایت کو بھول کر چند فروعی اختلافات کو لے کر چل پڑے اس کا نتیجہ حکمراں طبقے کے لئے مفید ہو سکتا ہے مگر کثیر عوام کے حق میں بڑا مضر ثابت ہوا۔ اسی کا تجربہ بیان کرتے ہوئے منصف لکھتا ہے:

''ان مٹھی لذتوں سے باقی کی عمر محروم رہنے کا خیال آتا ہے تو میرے گلے میں زہر کی کڑواہٹ بھر جاتی ہے۔ میرا جسم ہی نہیں میری روح تڑپنے لگتی ہے۔''

موضوع کے اعتبار سے بلونت سنگھ کے افسانوں کا کینوس بہت وسیع ہے ایسے تو انہوں نے اپنی کہانیوں میں بہت سارے موضوعات کا انتخاب کیا۔ لیکن پنجاب ان کا خاص الخاص موضوع رہا ہے انہوں نے جتنی بھی کہانیاں لکھیں ان میں بیشتر پنجات سے منسلک ہیں مثلاً پنجاب کے دیہات، پنجاب کے شہر، پنجاب کے میلے، پنجاب کے کسان، مزدور، ڈاکو، چور، کلرک، ہندو مسلم، سکھ عیسائی، طوائف، مردوں، عورتیں، آزادی کی تڑپ، فسادت، بھوک، بیکاری، بے روزگاری، بہادری، جواں مردی، رومانس، نفسیاتی گرہ کشائی، جنسی بے راہ روی، انسانی دوستی اور انسانی ہمدردی، اندوخرابات اور زاہد و پاک باز، متوسط اور پس ماندہ طبقہ اور اس کی ازدواجی رشتوں کا کھوکھلا پن نیز ان تضادات، ساہوکار، زمین دار، مذہب، لاہور، امرتسر، دہلی مبصر، کالج، گھر، ہوٹل، بوڑھے، بچے، جوان اور ان سب کی ذہنی الجھنیں وغیرہ بلونت سنگھ کے افسانوں کے موضوعات رہے ہیں۔ اس لئے ان کو پنجاب نگار ہی نہیں کہا جا سکتا بلکہ حیات نگار کہا جا سکتا ہے، ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ان کے بیشتر افسانے پنجاب کے ماحول میں ہی تخلیق ہوتے رہے ہیں۔

بلونت سنگھ افسانہ ''جگا'' کچھ طرح سے شروع ہوتا ہے پنجاب کے ایک علاقہ ''مانجھا'' میں چھوٹا سا گاؤں

''پھیکن'' ہے جس میں رہنے والے معمولی پنجابی دیہاتوں کی زندگی کو اجاگر کیا گیا ہے جیسے افسانوں میں کرداروں کے ذریعہ نمایاں کیا ہے اس میں وہاں کے ماحول کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔ کہانی کی ہیروئن گورنام کور اسی گاؤں پھیکن کی رہنے والی تھی۔ خوبصورت حسین اور بے انتہا پرکشش، کم عمر اور بھولی بھالی دوشیزہ تھی جس سے شادی کے لئے وہی نوجوان امیر کرسکتا تھا جو گاؤں کے سبھی نوجوانوں سے زیادہ طاقتور اور ہمت والا ہو۔ دلیپ سنگھ جو کہ کافی طاقتور ہے اور اپنے مقابلے میں آئے جوانوں کو شکست دے کر گرنام کور کے ساتھ شادی کرنے کا دعویدار بن جاتا ہے کیوں کہ گرنام کور کے بے حد حسین ہونے کی وجہ سے ہر کوئی اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

مجموعہ ''تاروپور'' کا دوسرا افسانہ ''گرنتھی'' ہے یہ افسانہ پنجاب کے دیہات کی فضاؤں کی عکاسی کرتا ہے جس میں ایک سکھ گردوارے کے گرنتھ کے پس پردہ متوسط طبقہ زندگی کے تضادات اور ان کے کھوکھلے پن کو طنز و تمسخر کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

بلونت سنگھ کا افسانہ ''دیمک'' اردو کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے اس افسانہ میں افسانہ نگار نے عورتوں کی فطرت کی عکاسی اور ان کے جذبات و احساسات کی مرقع کشی اتنی خوبصورتی سے کی ہے کہ یہ لگتا ہی نہیں کہ کسی مرد نے اس افسانے کو لکھا ہے۔ بلونت سنگھ نے اپنے تین مشہور و معروف افسانے ''سمجھوتہ''، ''دیمک''، ''چکوری'' میں عورتوں کے نازک سے نازک اور باریک سے باریک مسئلوں کی ایسی سچی اور جیتی جاگتی تصویر کشی کی ہے کہ لگتا ہے کہ کوئی ماہر نفسیات ان مسئلوں پر خانہ فرسائی کر رہا ہے۔

رام لعل کا افسانہ ''ایک شہری پاکستان کا'' تقسیم ہند کی سیدھی سادی گھریلو زندگی پر پڑنے والے اثرات کو ایک بالکل نئے انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس افسانے میں فسادات کے وقت ایک شخص اپنی بیوی، ساس، اور سسر سے بچھڑ جاتا ہے۔ بعد میں وہ ان لوگوں کو تلاش کرتا ہوا ہندوستان پہونچتا ہے مگر اس دوران یہ لوا سے مردہ سمجھ چکے ہوتے ہیں۔ اور اب اس کی بیوی کی دوسری شادی ہو چکی ہوتی ہے۔ دو شوہروں کے درمیان مجبور اور بے بس عورت اور اس طرح پیش کی گئی ہے کہ اس واقعہ کی المناکی کا احساس قاری کو ہوتا ہے دوسری طرف پہلے شوہر کی نفسیاتی کشمکش کا احساس کی ترجمانی کی بھرپور طور پر کی گئی ہے ایک سیدھی سادی گھریلو زندگی تقسیم اور فسادات کی آندھی میں عجیب و غریب روپ لیتی ہے۔ اس افسانے میں متوسط طبقے کی کہانی ہے۔

> ''سرسوتی کی ماں دونوں ہاتھوں سے منہ پر دوپٹے کا پلو رکھ کر سسکنے لگی۔ میری بیٹی کی زندگی تو غارت ہو گئی۔ ساری عزت مٹی میں مل گئی۔ ہائے اس کے جیتے جی دو دو گھر والے موجود ہوئے۔ ہائے، ہائے تو مر کیوں نہیں جاتی اسی دم! تیرے لیے دھرتی کیوں نہیں پھٹ جاتی! پاکستان سے تو عزت بچا کر یہاں آ گئی تھی۔ اب مر جانے کے سوا کونسا چارہ رہ گیا ہے تیرے لیے۔!'' (۱۳)

سرسوتی کے شوہر کی گم شدگی اور دوسرے شوہر سے شادی کے درمیان کا زمانہ ایک خاندان کے لیے کس قدر دشوار کن ہے اسے رام لعل نے سرسوتی کی نفسیاتی کیفیت کے سہارے بیان کیا ہے۔اس کے بعد پھر پہلے شوہر کے نمودار ہونے کا واقعہ ایسی کشمکش کو پیش کرتا ہے جس سے کہ صرف ایک خاندان وابستہ نہیں ، بلکہ ہندستان سے پاکستان اور پاکستان سے ہندستان آنے والے مہاجرین میں سے ہر ایک کا خاندان اس کشمکش سے دوچار رہا ہے۔اس افسانے میں مہاجرین کے آدھے ادھورے خاندان کی زندگی اور اس کے دوبارہ آباد ہونے کی مشکلات کو ایک وسیع تناظر میں پیش کیا ہے کہ کس طرح گھر بار لٹا کر دونوں ملکوں میں نقل مکانی پر مجبور ہوئے۔ان کے پاس سر چھپانے کے لیے ایک گھر بھی نہیں تھا،تقسیم اور فسادات نے ان کے خاندان اور جائیداد کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ رام لعل نے اجڑی ہوئی انسانی اور خانگی زندگی کا مرقعہ اس افسانے میں پیش کیا ہے۔

صالح عابد حسین کے افسانوی مجموعے ''نراس میں آلس'' کے اکثر افسانے تقسیم اور فساد سے متاثر ہونے کی نمائندگی کرتے ہیں۔خاص کر ان کا افسانہ 'ٹوٹ'' اور ''نراس میں آلس''،تقسیم اور فساد کے بعد ابھرنے والے واقعات کو ایک نئے موضوع کے طور پر منتخب کیا ہے۔

''نراس میں آلس'' ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو ناول اور افسانے لکھتی ہے لیکن فساد کی وجہ سے اس کا یہ سرمایہ آگ کے نذر ہو جاتا ہے۔اس صدمے سے وہ ذہنی اضطراب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔اور تخلیقی دنیا سے علیحدگی کا ارادہ کر لیتی ہے لیکن بعد میں وہ ان فسادات میں انسان اور خانگی زندگی کا جائزہ لیتی ہے تو ہوا پنے آپ کو کہتی ہے کہ ان لوگوں کے بارے میں سوچ جن کے خاندان اس ہنگامے میں فنا ہو گئے،اور پھر وہ یہ فیصلہ کر لیتی ہے کہ وہ اپنی تحریروں سے مٹے ہوئے سماجی اور خانگی نظام کا مداوا کرے گی۔

اس افسانے میں فسادات کے ہنگاموں کی تصویر کشی صرف چند پیراگرافوں میں کی گئی ہے لیکن ان فسادات سے ہونے والے اثرات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔اس میں وہ تمام باتیں بیان کی گئی ہیں کہ کس طرح ان فسادات میں بے گناہ اور معصوم جانیں انسان کی درندگی کا شکار ہوئی ہیں۔کیسے لاکھوں گھر تباہ برباد ہوئے ہیں اور لوگ خانہ برباد ہی نہیں بلکہ غریب الوطن بھی ہو گئے ہیں۔ان کے اپنے ان سے بچھڑ گئے ہیں اور در بدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔کتنی عورتیں اپنے سہاگ سے محروم ہو گئی ہیں۔اپنائیت اور بھائی چارے کے جذبات سب حرف غلط کی طرح مٹ گئے ہیں۔گویا ہندوستان کو آزادی تو ملی ہی ساتھ ہی ہندوستانی تہذیب اور اس کی اقدار کی شکست و ریخت کو بھی بڑھاوا ملا ہے۔الغرض اس میں صالحہ عابد حسین نے ہندوستانی تہذیب کی مٹتی ہوئی قدروں کا دل کھول کر ماتم کیا ہے۔

> ''...رو...بے شک رو...اس انسانیت پر جو ختم ہو رہی ہے۔اس
> تہذیب پر جو مٹ رہی ہے اس تمدن پر جو خاک میں ملا جا رہا ہے۔ان نام

نہاد مسلمانوں پر جو اپنی شرمناک حرکتوں سے اسلام کا نام بدنام کر رہے ہیں اور اپنے ہی بہن بھائیوں کے لیے اپنی وحشیانہ اور ذلیل حرکتوں سے اور زیادہ مصیبت اور تباہی کا باعث بن رہے ہیں۔ جو اسلام کی تعلیم سے بے خبر، مسلمان کی صفات سے بیگانہ، انسانیت سوز حرکات کے مرتکب ہوئے ہیں۔ رو، ان اخلاقی اقدار پر جو ظلم و فساد و تعصب و نفرت کی آگ میں ج کر بھسم ہو رہی ہیں۔'' (۱۴)

۱۹۴۷ کے انقلاب اور ہجرت کے موضوع پر یوں تو ہندستان کی ہر زبان میں اور کم و بیش ہر افسانہ نگار نے کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ لیکن ہمارے خیال سے اردو زبان میں تقسیم اور ہجرت سے پیدا ہونے والے واقعات کو سب زبانوں سے زیادہ موضوع بنایا گیا ہے۔

مذکورہ بالا افسانہ نگاروں کے علاوہ دیگر فنکاروں کی بھی اس موضوع پر عمدہ تخلیقات ہیں۔ مثلاً خواجہ احمد عباس، کا 'سردار جی'، اوپندر ناتھ اشک کا 'ٹیبل لینڈ'، قدرت اللہ شہاب کا 'یا خدا'، خدیجہ مستور کا 'ٹا مک ٹو یئے'، ہاجرہ مرور کا 'بڑے انسان بنے بیٹھے ہو'، سہیل عظیم آبادی کا 'اندھیارے میں ایک کرن'، عزیز احمد کا 'کالی رات'، سید محمد اشرف کا 'ڈار سے بچھڑے'، سریندر پرکاش کا 'بالکنی'، جیلانی بانوں کا 'سوکھی رات'، شوکت حیات کا 'گھونسلا'، ستیش بترا کا 'ویران بہاریں' وغیرہ اہم افسانے ہیں جن میں تقسیم اور ہجرت سے پیدہ شدہ ماحول و مسائل کے ہر پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اگر چہ زیادہ تر افسانوں میں مندرجہ ذیل موضوعات پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

۱- انسان کی جانی اتلاف

۲- مال و دولت اور جائداد کے بکھراؤ سے غریبی اور معاشی بدحالی

۳- رشتے اور قرابت درایوں میں دوری اور ملاقات کی پیچیدگی

۴- لسانی اور تہذیبی تصادم

۵۔ عورتوں کا اغوا مردوں کی جان کشی اور بچوں کی دریدگی و بریدگی

۶- نفسیاتی کشمکش

۷- مہاجرین کی افسوس ناک زندگی اور طرز رہائش کی کلفتیں

۸۔ نوسٹلجیاتی احساس

۹- افراد خاندان کی گم شدگی یا ہجرت اختیار کرنے اور نہ کرنے کی کشمکش

اور ان سب پیش نظر انسانیت کی تعمیر و تشکیل اور سماجی و معاشرتی برائیوں کے خاتمے کی تبلیغ و تلقین۔ انہی نکات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے افسانے کی بناوٹ ہوئی ہے۔ اور ظاہر ہے یہ ایسے مسائل ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح سماج و

خاندان سے ہے۔ خانگی زندگی کے صالح قدروں کی بقا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک معاشی، جانی، نفسیاتی، جنسی، انسانی، قرابتی، تعمیری اور تشکیلی طور پر سماج و معاشرہ مضبوط و مستحکم نہیں۔

فسادات اور ہجرت کی دیگر صورتیں موجودہ دور تک سلسلہ وار جاری رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں ان موضوعات پر آج تک افسانے لکھے جا رہے ہیں کیونکہ اردو کے بیشتر افسانہ نگاروں نے ہجرت اور فساد سے وابستہ مسائل و معاملات کی مصورانہ پیش کش میں جس انہماک و اخلاص کا اظہار کیا ہے اس سے اس امر کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے کہ ہندوستان کی سماجی اور خانگی زندگی کس طرح مسرتوں اور محرومیوں، امیدوں اور اندیشوں اور کرب انگیز پیچیدگیوں اور تبدیلیوں و تحریفوں سے گزرتی رہی ہیں۔ یہاں تک کہ اب بھی کہ جب خانگی نظام کی تمام دیواریں منہدم ہو چکی ہیں۔ انسان کے اندر محفوظ و مطمئن مستقبل کی حسرتیں باقی ہیں۔

حواشی

(۱) ابواللیث صدیقی، آج کا اردو ادب۔ ص: ۳۰۔۳۱

(۲) وقار عظیم، نیا افسانہ۔ ص: ۹۲

(۳) قمر رئیس، نیا افسانہ، مسائل اور میلانات۔ ص: ۳۱۔۳۲

(۴) قرۃ العین حیدر، پت جھڑ کی آواز۔ ص: ۲۸۱

(۵) قرۃ العین حیدر، پت جھڑ کی آواز۔ ص: ۸۷

(۶) راجندر سنگھ بیدی، اپنے دکھ مجھے دے دو۔ ص: ۱۲

(۷) وقار عظیم، نیا افسانہ۔ ص: ۲۰۸

(۸) کرشن چندر، ہم وحشی ہیں۔ ص

(۹) کرشن چندر، ہم وحشی ہیں۔ ص

(۱۰) عصمت چغتائی کے افسانے (اول)۔ ص ۱۴۲

(۱۱) وقار عظیم، نیا افسانہ۔ ص: ۲۱۰

(۱۲)

(۱۳) ڈاکٹر مغنی تبسم، وحید اختر، کہانیاں (پہلی جلد)۔ ص: ۶۸۴

(۱۴) صالحہ عابد حسین، نراس میں آس۔ ص: ۹۱

باب چہارم

جدید اور مابعد جدید افسانوں میں خانگی زندگی کی عکاسی

(الف) شہری اور دیہی اختلاط اور خاندان

(ب) نیوکلیر فیملی کا تصور اور اس کے اقدار

شہری اور دیہی اختلاط اور خاندان

آزادی کی پہلی دہائی کے بعد انفرادی اور اجتماعی، ریاستی اور قومی تجربات کی تاریخ جس طرح تاریخی کتابوں کے صفحات میں ملتے ہیں اسی طرح ادبی تخلیقات میں بھی ان تجربات و مشاہدات کے نمونے جابجا دکھائی دیتے ہیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں تخلیق کاروں نے رومانیت اور غم جاناں کی حکایتوں پر اپنی قناعت سخن کا انحصار کیا اور انہیں جذبات واحساسات پر اپنی تخلیق کی بنیاد رکھی۔ نصف صدی سے پہلے ادیبوں نے انسانیت کی فلاح، آدمیت کے تحفظ، معاشرہ کی اصلاح اور خامیوں کی نشاندہی کو اپنا فرض سمجھا۔ آزادی، تقسیم ہند اور فسادات کے زمانے میں انتشار اور بکھراؤ جیسے حقائق کی سنگینی سے آنکھیں بچانے کے بجائے اس کا مقابلہ کیا۔

1960 کے بعد اردو کے افسانہ نگاروں نے دورِ نو کے معاملات و مسائل کی مصورانہ پیش کشی میں جس انہماک و اخلاص کا اظہار کیا ہے اس سے اس امر کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے کہ جدید زندگی کی مسرتوں اور محرومیوں، امیدوں اور اندیشوں، دکھ، درد اور الجھنوں کی کرب انگیز پیچیدگیوں کی وجہ سے معاشرتی نظام اور خانگی ہیئت وساخت کی تعمیر وتشکیل میں نئے خطوط کے امکانات پیدا ہوئے ہیں۔ متعلقہ دور کی انفرادی اور اجتماعی، شخصی اور معاشرتی، کنباتی اور خاندانی آویزشوں، سرگرمیوں اور تبدیلیوں کے پس منظر میں خانگی زندگی کی ہیئت وساخت کا تعین اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک اس عہد کی سماجی اور سیاسی زندگی کے نشیب وفراز کی تاریخ کا جائزہ نہ لیا جائے۔

اس باب میں 1960 سے 2000 تک کی پوری افسانوی تاریخ میں خانگی زندگی کے دو اہم پہلوؤں کا مطالعہ کیا جانا موضوع خاص کے تحت آتا ہے۔ اول جمہوریت اور سیاست کے اثرات خاندان پر کس طرح مرتب ہوئے جس سے شہری اور دیہاتی اختلاط کے اسباب وعوامل میں تیزی آئی۔ دوم یہ کہ اس پورے دور میں اسباب ومحرکات کی کیا نوعیت رہی جس نے مشترکہ خانگی نظام کی وسعت کو محدود کر کے نیوکلیر فیملی کے تصور اور اس کے اقدار کی بنیاد ڈالی۔ انہیں دونوں نکات کے تناظر میں ہم افسانوی تاریخ کا تجزیہ کریں گے لیکن اس سے قبل اس عہد کی تاریخ کا جائزہ لیں تو بے شمار تبدیلیاں ہمارے سامنے ابھر کر آتی ہیں جس کا ذکر اس دور کے افسانوں میں ملتا ہے چونکہ اردو افسانہ کی تاریخ اس عہد میں دو حصوں پر مشتمل ہے یعنی 1960 سے 1980 تک کی افسانوی تاریخ کی نوعیت اس کے بعد کی تاریخ

سے جداگانہ حیثیت کی حامل ہے۔ کیونکہ اس مدت میں دونسلوں کی ترقی ہوتی ہے، ایک آزادی کے بعد کی نسل جس کے سماجی سیاسی اور فکری شعور روایتی اقدار سے ہم آہنگ تھے ان میں ظاہری تبدیلیوں کے ساتھ ذہنی بدلاؤ کا سلسلہ جاری تھا لیکن اس کا عکس بہت دھندلا تھا۔ دوسری وہ نسل جن میں 1980 کے بعد قومی اور بین الاقوامی سیاسی اور سماجی، تجارتی اور معاشی، موروثی و خاندانی آئینی اور قانونی جدت کی بنیاد پر بے شمار تیز رفتار تبدیلیاں رونماں ہو رہی تھیں۔ اس کے بعد کے ہر دہائی میں بتدریج حالات کے یکسر بدل جانے کا گمان ہوتا ہے۔

1960 کے بعد ہمارے ملک میں سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی سطح پر کئی اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں جن سے غور وفکر کا انداز بدلا، دیہات اور قصبوں کی طرز رہائش میں تبدیلی آئی۔ چونکہ افسانہ نگار خود نئے ذہن کے مالک تھے، لہذا اب وہ ان روایتوں کی سطح سے اٹھ کر نئے افق دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ فرد کی خارجی زندگی میں ہی انقلاب نہیں آیا بلکہ اس کے ذہن وتخیل اور افکار وشعور کا ڈھانچہ بھی نیا ہو گیا گویا ایک نیا ذہنی نظام وجود میں آیا جو نئے زمانے کے ساتھ چلنے کا خواہش مند تھا۔

> ''آزادی کے بعد ہندستان میں لوگ دیہاتی زندگی پر شہری زندگی کو ترجیح دینے لگے۔ کچھ تو روزگار کی تلاش میں آئے اور شہروں میں بسنے لگے اور بعد میں اس شہری زندگی کے اس قدر عادی ہو گئے کہ وہ دوبارہ دیہاتوں میں واپس نہیں جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی شہری زندگی میں ایک نیا اخلاق اور ایک نئی سماجی زندگی نمو پذیر ہوئی جس میں سماجی اور اخلاقی قدروں کی کشمکش بخوبی دیکھی جا سکتی ہے۔ نئی قدریں پرانی قدروں پر غلبہ پاتی جا رہی ہیں۔ نئی تہذیب تعلیم وتمدن اور نئی اقدار کی دین عورتوں کی آزادی یا آزادئ نسواں بھی ہے۔ آج کی عورت گھر کی چہار دیواری سے باہر نکل کر مرد کے شانہ بشانہ چل رہی ہے۔ اب وہ اپنی زندگی کو ایک نیا موڑ دے چکی ہے اور اپنے طور پر جینا چاہتی ہے۔ اس میں اپنا حق مانگنے کی جرأت پیدا ہو گئی ہے اس کے وجود بھی وہ اپنے مقاصد میں کامیاب نظر نہیں آتی۔''(۱)

اس دور میں انسان مختلف المناکیوں سے دوچار ہو کر انفرادیت اور وجودیت کی خول میں بند ہو گیا تھا، وہ اقدار اور نصب العین جو پچھلی صدیوں میں ایک مرکزی اور متحد کرنے والی قوت کا درجہ رکھتے تھے اب قابل قبول نہیں رہے، مزید یہ کہ پرانی قدروں سے محروم ہونے کے بعد بھی وہ راہ گم کردہ مسافر کی طرح بھٹک رہا تھا اور نئے نصب العین کے انتخاب کی کوئی صورت انہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ غرض کہ انسان رفتہ رفتہ انسانی خصوصیات سے محروم ہوتے جا رہا تھا جس سے اس کی شناخت اور احساس ذات بھی مفقود ہوتی جا رہی تھی۔

یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ خاندانی نظام ہی کی بدولت انسانوں کی یہ دنیا دیگر مخلوقات کی دنیا سے ممتاز ہے۔ خاندانی نظام نہ ہوتو انسانوں کی پرسکون زندگی کا وجود خطرے میں پڑ جائے، زندگی میں کوئی امتیاز باقی نہ رہے اور حقیقت یہ ہے کہ خاندانی زندگی کا تصور اور خاندانی نظام کے اصول واقدار، انسانی عظمت کی امتیازی علامت اور شان ہے۔ یہ خاندانی نظام اگر چہ ہمارے معاشرے میں ہندوستانی تہذیب وثقافت کے معیاری مطلوب کے مطابق آج اپنی اعلیٰ خصوصیات ولوازم کے ساتھ قائم نہیں اس کی ہیئت وساخت میں بہت تبدیلی آ چکی ہے اس کے اقدار وافکار کی پرانی نوعیتیں مٹتی جارہی ہیں۔ رشتے اور قرابت داری کی زنجیریں ٹوٹ رہی ہیں۔ اخلاف واسلاف کے درمیان کشمکش اور پیچیدگیاں بڑھتی جارہی ہیں بزرگوں کی اتالیقی حیثیت اپنی معنویت کھوتی جارہی ہے۔ مردوں کی قوامیت پر عورتوں کے مساویانہ حقوق غالب آرہے ہیں۔ نئی نسلوں میں آزادانہ اور بے راہ رویانہ سلوک جاگزیں ہو رہے ہیں۔ بچوں کے تئیں والدین کے فرائض اور ذمہ داریاں محبت سے عاری ہوتی جارہی ہیں۔ لیکن پھر بھی جو کچھ اور جیسا کچھ اور خاندان کی جو بھی شکلیں موجود ہیں، اس کی قدروں کی اہمیت، ضرورت کا احساس اور ضابطے کے پیمانے جس درجہ بھی باقی ہے اسی کی وجہ سے ہماری زندگیاں سماجی سکون وطمانیت کی لذت سے آشنا ہیں، ہمارے گھر، سکون و راحت کے مفہوم ومدعی سے شادکام ہیں، اولاد اور بیویوں سے وابستگی کے مراسم کے تصور سے واقف ہیں۔ آج ہمارے سماج میں ادب ولحاظ اور احترام وتعظیم جیسے الفاظ کی معنوی حدود سمٹ رہی ہیں۔ ایثار وقربانی، دلجوئی وغم گساری کے مہر و مروت کے الفاظ ہمارے سماج میں مصنوعیت کا لبادہ اوڑھ لئے ہیں۔ لیکن پھر بھی خاندانی نظام کے اثرات سے آج بھی ہم کسی نہ کسی درجہ فیضیاب ہیں۔ اس تلخ احساس اور اعتراف کے باوجود کہ ہم بہت کچھ کھو چکے ہیں۔

آزادی کے بعد کے افسانہ نگاروں میں رام لعل مشہور ومعروف افسانہ نگار ہیں۔ جن کے افسانوں میں آزادی کے بعد ملک کی سماجی حقیقت نگاری، صنعتی ترقی کی وجہ سے دیہات سے شہر کی طرف ہجرت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خانگی زندگی کے مسائل، تعلیمی واختراعی میدان میں وسعت کی وجہ سے متوسط طبقے کی گھریلو زندگی میں رشتوں کے بندھن کے ٹوٹنے اور بکھرنے کے حالات اور نئی نسلوں کی ذہنی بیداری کے بعد معاشرے میں رہن سہن، طور طریقہ، عادت واخلاق، افکار وخیالات اور مذہبی وتہذیبی بے زاری کی سرگرمیوں کے عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان کا افسانہ ''آنگن'' کی کہانی ایک ایسے متوسط خاندان کے اردگرد گھومتی ہے جس کا کردار مشترکہ خاندانی روایت اور وراثت میں تقسیم اور بکھراؤ کو جذباتی طور پر محسوس کرتا ہے۔ رام لعل نے اس افسانہ کے ذریعہ ازدواجی زندگی کی کشمکش اور معاشی حالات کے زیر اثر ایک متوسط خاندان کے گھریلو زندگی کی تلخ اور شیریں داستان کو بیان کیا ہے اور اقتصادی پریشانیوں کی وجہ سے وراثت جس سے کہ ماضی کی یادیں وابستہ تھیں کے لٹنے کے عوامل کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کہانی کا واقعہ یہ ہے کہ ایک چھ کمروں کی بنی عمارت کے بڑے سے آنگن کا پارٹیشن کر کے راوی کی بیوی اس سے کرایہ حاصل کرنا چاہتی ہے لیکن اس کا شوہر نریندر کو اس پر صرف اس لئے اعتراض ہوتا ہے کہ اس سے اس کے آباء واجداد اور خود اس کی بہت سی

یادیں وابستہ ہیں دوسری یہ کہ یہ آنگن اس گنگا جمنی تہذیب کا بھی مسکن ہے جس سے سماجی رشتوں کو مضبوطی ملتی ہے کیوں کہ اس آنگن میں کتنی ہی شادیوں اور تیوہاروں میں لوگ ایک دوسرے سے قریب ہوئے تھے یہاں تک کہ اس کے پرکھوں نے اسی آنگن میں ہندو اور مسلمان کے درمیان پھیلی پیچیدگیوں کی بھی صلح کرائی تھی۔

اس کہانی سے براہ راست خانگی نظام حیات کے وہ پہلو اجاگر نہیں ہوتے جس سے کہ اس کی ہیئت وساخت میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہو۔ یا دیہات سے شہر کی طرف ہجرت اس تبدیلی کا باعث بنا ہو۔ محض سماجی اور تہذیبی اقدار کے مٹنے کا اشارہ اس میں موجود ہے۔ لیکن بالواسطہ طور پر آنگن کی پارٹیشن کی نوعیت بہت سارے مشترکہ خاندان میں ہونے والے پارٹیشن کے واقعات سے ہم آہنگ ہے اور اس کے ضمنی کردار جس کی وجہ سے پارٹیشن واقع ہو رہی ہے وہ لوگ وہی ہیں جو دیہات سے شہروں کی طرف ہجرت کر رہے ہیں اور ملازمت کی غرض سے مشترکہ خاندان کو خیرآباد کہہ کے اسی طرح کے کرایہ کے کمروں کی چہار دیواری میں محدود ہو کر مرکزی خاندان کی بنیاد ڈال رہے ہیں۔ رام لعل کے اکثر افسانوں میں متوسط طبقے کی خانگی زندگی کے مسائل اور مصائب نظر آتے ہیں۔

رام لعل نے صنعت کی ترقی اور تجارت و پیشہ کے پھیلاؤ کے نتیجے میں مشترکہ خاندان کے ٹوٹنے اور بکھرنے کے تلخ احساسات کو بھی اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے اس موضوع پر ان کا افسانہ ''شیرازہ'' ان کی ایک اہم تخلیق ہے اس میں خانگی زندگی کے اقدار کی شکست وریخت اور مشترکہ خاندان کے انتشار کا ذکر ہے۔ دیہی اور شہری اختلاط کے بعد وہ قدریں جو زمانہ کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ تبدیل ہوتی جا رہی ہیں اور اس تبدیلی کی اصل وجہ تعلیمی بیداری، صنعتی ترقی اور شہری زندگی کی طرف لوگوں کا بڑھتا رجحان ہے۔ چودھری صاحب کا خاندان کس طرح بکھر جاتا ہے اور ان کے بچے مختصر فیملی کے نظام سے منسلک ہو کر اپنے پرکھوں کو کس طرح بھول جاتے ہیں، اس افسانہ میں رام لعل نے انہی مسائل اور احساس کو بیان کیا ہے۔

چودھری صاحب اعلیٰ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور مشترکہ خاندان کے نظم وضبط کے خواہاں ہیں۔ آباء و اجداد کے زمانہ کے مروج قدروں کی پاسبانی کا والہانہ جذبہ رکھتے ہیں۔ ان کے چار بیٹے ہیں سبھوں کو انہوں نے اعلیٰ تعلیم دلوائی ہے ان میں سے تین مختلف شہروں میں مرکزی خاندانی نظام کے تحت عیش وآرام سے زندگی گذارتے ہیں اور اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ جب کہ چوتھا ابھی زیر تعلیم ہے۔ چودھری صاحب پرانی قدروں کے تحفظ کی خاطر ایک ایسے گھر کی تعمیر کے خواہاں ہیں۔ جس میں چاروں بیٹے آکر ایک ساتھ رہیں اور ہندوستان کے مشترکہ خاندان کی ایک ایسی شکل تعمیر کریں جو اسلاف کی قدروں اور سماج کی روایتوں سے ہم آہنگ ہو۔ جب مکان پورا بن جاتا ہے تو نئے گھر میں جانے کے لئے مذہبی رسومات کی ادائیگی ہوتی ہے۔ اس موقع پر وہ اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں سب کے ساتھ بیٹھ کر وصیت نامہ نکالتے ہیں اور سب بیٹوں سے کہتے ہیں:

''زندگی کا تو کوئی بھروسہ نہیں۔ اب تم لوگ جلدی یہاں آکر بس

جاؤ۔ میری آنکھوں کے سامنے۔ جس گھر کو بنوانے میں میں نے اپنی پوری
پونجی صرف کر دی ہے اس میں تم سب کو رہتے ہوئے بھی تو دیکھ لوں۔'' (۲)

لیکن اس کی خواہش کی تکمیل کوئی نہیں کرتا وہ لوگ اپنے بوڑھے باپ کی قدر کرتے ہوئے اپنے عیش و آرام کی زندگی کو ختم نہیں کرنا چاہتے کیونکہ اب ان کی طرز زندگی اور معیار زندگی بدل چکی ہے، اب ان کا اپنا خاندان ہے۔ صنعتی ترقی کے نتیجے میں مشترکہ خاندان کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا جو تلخ احساس چودھری صاحب کے چہرے پر جھلکتا ہے اس کو بیان کرتے ہوئے رام لعل لکھتے ہیں:

''چودھری صاحب کو یوں لگا جیسے ان کی ساری محنت پر پانی پھر گیا
ہو۔ وہ دیر تک کچھ بول ہی نہ سکے۔ ان کے لڑکے اپنے اپنے بچوں کو لے کر
کھسک گئے۔ کسی کو سسرال جانا تھا۔ کسی کو اپنے دوستوں سے ملنے۔ کسی پر تو
پکچر دیکھنے کی دھن سوار تھی۔ چودھری صاحب اور ان کی بیوی وہاں اکیلے
بیٹھے رہ گئے۔ اتنے بڑے مکان میں اکیلے... نیا ذہن گذشتہ دور کی ہر
خوبصورت شئی کو مٹاتا اور روندتا ہوا آگے بڑھ آیا ہے۔ اب وہ لوگ اپنا
ڈومینیشن چاہتے ہیں جو مکاری اور خودغرضی اور گالی گلوج کے علاوہ ہر ایک
تسلیم شدہ قدروں کی مخالفت کرنا اپنا دھرم سمجھتے ہیں۔'' (۳)

اس فسانہ میں خاندان کے ان بزرگوں کا ذکر ہے جو پرانی قدروں سے وابستہ ہیں اور دوسری طرف اس بات کی طرف نشاندہی ہے کہ نئی نسل اسلاف کے نقشے قدم پر چلنے اور اقدار کی پیروی کرنے سے منحرف ہو رہی ہیں کیوں کہ اب قدریں بدل گئیں ہیں سب کے سوچنے سمجھنے کا انداز بدل گیا ہے بزرگوں کا سہارا بننے کے بجائے اپنی آسائش کا خیال کرنے لگے ہیں شہری زندگی کی ہمہ ہمی نے رشتے اور قرابت داری سے وابستگی کو منتشر کر دیا ہے۔ اس تبدیلی کا سب سے زیادہ اثر یہ ہوا کہ مشترکہ خاندانی نظام میں ٹوٹنے اور بکھرنے کے سلسلے میں شروع ہوئے اور موجودہ نظام حیات کے تحت مرکزی خاندان کے چراغوں کا سفر جاری ہوا۔ ''چراغوں کا سفر'' کے دیگر افسانے ایسے موضوعات پر مشتمل ہیں جن میں مشترکہ خاندان کے مٹنے اور دیہاتی و شہری اختلاط کے نتیجے میں مرکزی خاندان کے ابھرنے کا بیان ہے۔

احمد یوسف چھٹی دہائی کے وسط میں تخلیقی شعور کا مظاہرہ کرتے ہیں اور روایتی اقدار سے انحراف و قبول کی دونوں صورت میں افسانے لکھتے ہیں۔ ان کے ابتدائی افسانوں کی بنیاد اس عہد کے خلفشار، داخلی کرب، ذاتی اضطراب، محرومی و نا آسودگی اور حیرت و یاس پر ہے لیکن وہ اپنے ہم عصروں میں اس اعتبار سے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا اوصاف کے باوجود انہوں نے اپنی تخلیقی حسیت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ قاری کے لئے غیر مانوس نہیں رہتا۔ وہ استعارات و علامات کا استعمال فطری تقاضوں اور تخلیقی طریقۂ کار کے حدود میں رہتے ہوئے اس طرح کرتے ہیں کہ ان

میں افسانویت اور کہانی کی حیثیت بھی برقرار رہتی ہے۔انہوں نے بکھری ہوئی زندگی کی پیچیدہ حقیقتوں اور کرب ناکیوں کو ایسی شکل دی ہے کہ وہ انسانی استحصال، تہذیبی انحطاط، تقسیم ہند کے مضرات اور خاندانوں کے انتشار کی معنی خیز داستان معلوم ہوتی ہے۔ احمد یوسف نے اپنی تخلیقی زندگی میں اردو افسانے کو عمدہ نمونے عطا کئے۔ان کے افسانوی مجموعے چار ہیں۔''آگ کے ہمسایہ''(1980)''روشنائی کی کشتیاں''(1976)''تیئس گھنٹے کا شہر''(1984) اور''رزم ہو یا بزم''(2004) اس کے علاوہ ریورتاژہ اور خاکوں کا ایک ایک مجموعہ بہار اردو لغت اور تین ناولٹ پر مشتمل ایک مجموعہ''چلتا ہوا جنگل'' بھی ان کے اہم کارنامے ہیں۔ انہوں نے سماجی اور خانگی زندگی کے مضمرات کو جداگانہ طریقے سے افسانوں کا موضوع بنایا ہے ان کی تخلیقات میں شہری اور دیہی زندگی کی ترجمانی ان کے اپنے اپنے ماحول کے پس منظر میں کی گئی ہے۔ان کا افسانہ''تلوار کا موسم'' ایسا افسانہ ہے جس میں تقسیم ہند کے بعد رونما ہونے والے خون آشامی اور انسانیت سوزی کے نقوش بھی ہیں۔تہذیبی انحطاط، ظلم واستبداد اور استحصال کے نتیجے میں پیدا ہونے والی خانگی زندگی کی صورت حال اور دیہی زندگی کا مٹتا ہوا خاندانی نظام واضح شکل میں موجود ہے۔

''حسن پور سے''اس افسانہ میں انہوں نے مشترکہ خاندانی زندگی کے مہذب نظام حیات اس کا آئین واصول ،اقدار وافکار کی تصویر کشی کرنے کے بعد دیہات کی سوسائٹی کا فطرت سے لگاؤ اور دیہاتی اشیاء کی فطری خصوصیات کا ذکر بحسن وخوبی کیا ہے۔کہانی یہ ہے کہ دیہی سماج کے مشترکہ خاندان میں زندگی کے شب وروز فطری اور روایتی طرز پر گذر رہے ہوتے ہے لیکن جب اسلاف کی زندگی ختم ہوتی ہے اور نئی نسل کے ذمہ اس کے فرائض آتے ہیں تو اس میں یکسر بدلاؤ آجاتا ہے۔ذیل میں اس افسانہ کا اقتباس نقل کیا جاتا ہے،جس سے دیہات کا مشترکہ خاندان اور اس کے بعد اس کے شہری خاندان میں مدغم ہونے کی صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے۔

> ''تبریز بھائی نے دو تین دنوں میں ہم لوگوں کو وہ چیزیں کھلائیں، جو شہر میں اپنی اصلی حالت میں کسی قیمت پر نہیں مل سکتی تھیں۔مٹی کی ہانڈی میں پکایا ہوا دودھ کہ جس سے سوندھی سوندھی خوشبو آتی اور جس کے اوپر بالائی کی ایک موٹی پرت ہوتی۔سرخی اور زردی کا ایک بے حد حسین امتزاج لئے۔اس پر ہم نے تبریز بھائی سے کہا۔'تبریز بھائی آج تک یہ نہیں جانتے تھے کہ دودھ کے اوپر جو بالائی کی موٹی پرت ہوتی ہے۔اس کا اصل رنگ کچھ سرخ سا کچھ زرد سا ہوتا ہے، یا یوں کہئے کہ دونوں رنگوں کی ایک عمدہ آمیزش سے وجود میں آتا ہے اور پھر یہ دونوں رنگ الگ الگ ہو جاتے ہیں'۔ہم نے محسوس کیا کہ تبریز بھائی خوشی سے پھولے نہیں سمارہے ہیں۔ انہوں نے حسب معمول بلند آواز میں کہا۔''بھائیو۔ دراصل فطرت تو

دیہات ہی میں بستی ہے، افسوس کہ تم شہر والے بہت سے ایسے علوم سے
بے بہرہ ہو، جن سے ہماری گہری واقفیت ہے مثلاً کہا تم جانتے ہو کہ اگر
ایک گلاس دودھ میں دو چار تخمی آم کا رس نچوڑ دیا جائے تو پینے پر وہ سارے
کا سارا خون بن جاتا ہے۔'' (۴)

روایتی اور ٹھہرے ہوئے دیہاتی سماج کے خانگی نظام سے افکار و اقدار کس طرح متعلق تھے اس کا اندازہ اس اقتباس سے بخوبی ہوتا ہے کہ دیہی خاندان میں ضیافت اور مہمان نوازی کا جذبہ اور مشترکہ رشتوں سے والہانہ لگاؤ روایتی انداز میں موجود ہے، تبریز بھائی کا کردار ایک ایسے نظام کا پروردہ ہے جو کسان ہونے کے باوجود ادب، مذہب اور تہذیب کے ہر پہلو سے آشنا ہے۔ اس طرح وہ اس اقتباس میں مشترکہ خاندان اور مشترکہ رشتوں کی خصوصیت کے ساتھ ساتھ دیہی سماج اور خاندان کی زندگی کے مطالعہ کے لئے اہم مواد فراہم کرتے ہیں۔

''رام پرتاب براہل کہہ رہا تھا۔ ''بڑے بابو، تبریز بھیا کل رات گزر
گئے ...۴ بجے مٹی منزل ہے۔'' اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ لانبے
چوڑے کسان تبریز بھائی۔ ڈھلتے ہوئے برطانوی عہد کی یادگار۔ آم کھانے
کے مقابلے میں کہیں گئے تھے، کئی الٹیاں آئیں اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے چل
بسے۔ شیخ صاحب نے پوتے کو محجوب نہیں کیا اور ساری جائداد بزمی کو لکھ
دی۔ لیکن ان کے مرنے کے بعد بزمی شہر چلا گیا۔ وہاں بزنس میں پیسے
لگانے کے لئے اس نے دھیرے دھیرے ساری اراضی بیگھے کے حساب
سے بیچ دی۔ ''ماموں جان سوچئے کاشت کا ہمیں Return کیا ملتا تھا'' نہ
کہیں تبریز بھائی تھے اور نہ شیخ صائم علی، مگر وہ بوسیدہ حویلی جس کے پاس ہی
تبریز بھائی کا خاندانی قبرستان تھا، دور سے دکھائی دے رہی تھی۔'' (۵)

خاندانی اکائی کی دونوں صورتیں اس میں موجود ہیں اور دونوں کا تجزیہ اس طور پر کیا جا سکتا ہے کہ خاندانی اکائی کے ٹوٹنے کا ہندوستانی سماج پر کس طرح گہرا اثر پڑا ہے اس افسانہ میں احمد یوسف نے دیہات سے شہر کی طرف ہجرت اور مشترکہ خاندان کا مرکزی اور شہری خاندان میں بدلنے کی کیفیت اور اس کے رجحانات و امکانات کو اجاگر کیا ہے اس کے علاوہ 'خواب گر خواب شکن'، 'گھر چلانے والی' اور 'بڑے گپتا چھوٹے گپتا' ان کے ایسے افسانے ہیں جن میں شہر اور دیہات کی متضاد کیفیتوں کے ساتھ ساتھ اس کی خانگی زندگی کی مختلف شکلوں کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔

جوگندر پال دور جدید کے ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جو انسان کی داخلی کیفیت اور انفرادی فکر کے انتشار کے باوجود معاشرتی بصیرت اور تہذیبی اقدار کی شکست کو اجتماعی اور سماجی پس منظر میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں

میں عصری حقائق سے پنپنے والے تاثرات کے عمدہ نمونے موجود ہیں انہوں نے اپنے عہد کی خارجی المناکیوں کو جتنی شدت سے محسوس کیا ہے اتنی ہی شدت سے اسے اپنے تخلیقی شعور کا حصہ بنایا ہے۔

اس عہد میں ملک کے اندر ترقیاتی امور کی طرف توجہ دی جارہی تھی جاگیردارانہ اور زمین دارانہ نظام کے خاتمے کی پالیسی کا نفاذ ہو چکا تھا۔ کسان، مزدور اور دیگر دبے کچلے طبقے شعوری طور پہ بیدار ہو رہے تھے۔ کسان طبقہ زمین کی حصولیابی کے بعد معاشی حالت کو بہتر بنانے کی تگ ودو میں تھا اور دیہی زندگی سے وابستگی کے باوجود شہری ماحول اور سیاسی محکموں سے رابطہ بڑھا رہا تھا جبکہ مزدور طبقہ دیہات سے شہروں کی طرف منتقل ہو کر صنعتی اداروں سے وابستگی اختیار کر رہا تھا اور کسی دوسرے کاموں یا تجارتوں سے منسلک ہو رہا تھا۔ اس کا واحد مقصد بہتر سے بہتر زندگی کی تلاش اور خانگی زندگی کے اخراجات سے سبکدوشی تھی۔ لیکن ان کی ان ساری کوششوں کے نتیجے ان کے مقاصد کے برعکس نکلے۔ کیوں کہ زمین دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کے خاتمے کے باوجود ملک کے اندر طبقاتی کشمکش اور ذات پات کے رویے اس طرح غالب تھے کہ اعلیٰ طبقہ نچلے طبقے کی استحصال کی فکر سے اب تک دستبردار نہیں ہوا تھا۔ اسی طرح ملک میں مزدوروں اور سرمایہ داروں کے عمل اور ردعمل کو دیکھتے ہوئے مختلف طرح کے قوانین کا نفاذ ہوا لیکن پھر بھی اس مزدور کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا جس نے اپنے گھر بار اور رشتہ داروں کو خیرآباد کہہ کر شہروں کا رخ کیا تھا۔ یہاں پر اگرچہ ایک سوال کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ آپ کہیں گے کہ بہت سارے گاؤں سے شہر کی طرف آنے والوں نے اپنی حیثیت کو بہت بلند کیا اور معاشی اعتبار سے اچھی حیثیت کے مالک ہوئے؟ اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ ہر وہ فرد جس نے شہروں کی طرف رخ کیا اس کی حالت میں بہتری، استحصال کے بعد یا غیر سماجی عمل کے ارتکاب سے ہی آئی ہوگی ۔

اس طرح کے موضوعات جن میں طبقاتی کشمکش اور شہری زندگی کی بڑھتی الجھنوں اور دیہات سے ملازمت کے لئے شہر کی طرف ہجرت کرنے والوں کی حقیقت بیانی کی گئی ہوں جوگندر پال کے متعدد افسانوں میں موجود ہیں۔ مثلاً ''بے چارہ''، ''بیک لین''، ''بھوکا'' وغیرہ ان کے ایسے افسانے ہیں جن میں محنت کش اور نچلے طبقوں کی آئینہ داری بھی ہے اور شہری خاندان اور افراد کے تہذیبی اور معاشرتی قدروں سے انحراف کی عکاسی بھی۔ افسانہ ''بے چارہ'' میں سماج کی طبقاتی کشمکش اور درجاتی تقسیم کو انہوں نے ان کی فاقہ کشی اور خوشحالی کے متضاد پس منظر میں بیان کیا ہے۔ ان سب افسانوں کے مطالعہ اور تجزیہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے دیہات کی بڑی آبادی شہروں کی طرف منتقل ہو رہی ہے اور ترقی کے مقابلہ جاتی ریس میں حصہ لے رہی ہے۔ ان کی یہ مصروفیت نہ صرف مرکزی خاندان کے بکھرنے کی محرک ثابت ہو رہی ہے بلکہ خاندانی نظام میں پائے جانے والے مذہبی، تہذیبی اور ایثار وقربانی کے جذبات کو بھی مجروح کر رہی ہے اور قرابت داریوں کے نظام پر بھی بہت زیادہ اثر انداز ہو رہی ہے۔ ہندوستان کے بڑے شہر یعنی ام البلاد، بڑے صنعتی مراکز ہونے کی وجہ سے دیہات اور گاؤں سے آنے والوں کا سب سے بڑا مسکن ہو گیا ہے۔ صنعتی ترقی کی تیز رفتاری اور دیگر معاشرتی عوامل کے بنا پر لوگوں کا رجحان اس کی طرف بڑھا ہے اور

یہ دوطریقے سے خانگی نظام کومتاثر کررہا ہے۔ایک تو یہ کہ وہ خاندان جو دیہات میں کثیرافراد پر مشتمل تھا اس میں تقسیم کی کیفیت پیدا ہوئی اور دوسرا یہ ہے کہ دہلی ممبئی اور کلکتہ سے شہروں میں نیوکلیر خاندان کی تعداد تیزی سے بڑھنے لگی۔ حالانکہ خاندان کے بکھرنے اور سمٹنے کا یہ سلسلہ کسی نہ کسی طور پر ہر عہد میں جاری رہا ہے مگر اس کی حرکت پذیری بہت سست تھی۔آزادی کے بعد صنعتی اور تجارتی آزادی نے جس طرح بین الاقوامی اور قومی صنعت ومعیشت کو متاثر کیا ،بتدریج خاندان کی کمیت وکیفیت میں بھی تبدیلیاں تیز ہونے لگیں۔

قاضی عبدالستار ہم عصر افسانہ نگاروں میں موضوعات اور اسلوب کے اعتبار سے امتیازی شان رکھتے ہیں۔ تاریخ، دیہات،شہر اور سماجی عروج وزوال پر لکھنے والا ان کے علاوہ کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔انہوں نے جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ،متوسط طبقے کی بدحالی،نئی نئی طبقاتی کشمکش،زمین داروں کی سماجی اور معاشی ابتری،خاندانی اکائی کے ٹوٹنے اور بکھرنے کے سلسلے اور جدید صنعتی اور معاشی تبدیلیوں سے دوچار ہندوستان کی صورت حال کو اپنے افسانوں کا مستقل موضوع بنایا ہے۔

ہندوستان میں زمین داری کے اعلان کے ساتھ ہی ایک پورے طبقے،ایک دور اور ایک تہذیب کا خاتمہ ہوگیا۔ ان کے مطابق زمین داری کا خاتمہ ایک خاموش انقلاب تھا جس کو بہت کم محسوس کیا گیا۔ان کا تعلق خود ایک خوشحال زمین دار گھرانے سے رہا ہے۔انہوں نے اس طبقے کے خاندانی نظام حیات اور ان کی شان وشوکت،روایات اور وضع داریاں اور دیگر تہذیبی اقدار کا نزدیکی سے مشاہدہ کیا ہے۔اس لئے پرانی قدروں کی زوال اور نئے ڈھنگ کے خاندانی صورت حال کو اپنے تجربات کی روشنی میں بے پناہ اثرانگیزی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

پیتل کا گھنٹہ: یہ افسانہ قاضی عبدالستار نے جاگیردارانہ نظام کی گرتی ہوئی دیواروں کے موضوع پہ لکھا ہے اس میں مصنف نے ایک خاندان سے وابستہ پرانے وقت کے لوگوں کے خلوص ومحبت اور وضع داری کے ساتھ ساتھ معاشی ابتری کی وجہ سے خانگی زندگی کی شکستہ حالت کو پیش کیا ہے اس افسانہ میں جدید اور قدیم خاندانی نظام آپس میں دست و گریباں نظر آتے ہیں،انہوں نے قاضی انعام حسین اور اس کی بیوی کی غربت اور عسرت زدہ زندگی میں بھی مہمان نوازی کی اعلیٰ قدر کے تحفظ کے جذبات کی نشاندہی کی ہے۔پورے افسانے میں جاگیردارانہ خاندان کی شان وشوکت کے ساتھ ان کی مٹتی ہوئی عظمت کو پیش کیا ہے یعنی جب ان کا داماد ان کے گھر آتا ہے تو وہ اپنی شان وشوکت کا اظہار اس کی خوب خاطر داری کے طور پہ کرتے ہیں۔اور اس کے لئے خاندان کی عظیم نشانی پیتل کے گھنٹے کو بیچ دیتے ہیں اور مزید نذرانہ بھی پیش کرتے ہیں۔جو کہ جاگیردارانہ خاندانی نظام کی اہم قدریں ہیں۔

> ''جب میں اپنا جوتا پہننے لگا تو رات کی طرح اس وقت بھی دادی نے
> مجھے آنسو بھری آواز سے روکا۔ میں معافی مانگتا رہا۔ دادی خاموش کھڑی
> رہیں۔ جب میں شیروانی پہن چکا دروازے پر یکہ آ گیا تب دادی نے

کانپتے ہاتھوں سے امام ضامن باندھا ان کے چہرے پر چونا پتا ہوا تھا۔
آنکھیں آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں۔ انہوں نے رندھی ہوئی آواز
میں کہا۔ ''یہ اکاون روپے تمہاری مٹھائی کے ہیں اور دس کرائے کے۔''''
ارے...ارے دادی....آپ کیا کر رہی ہیں۔'' اپنی جیب میں جاتے ہوئے
روپیوں کو میں نے پکڑ لیا۔ ''چپ رہو تم...تمہاری دادی سے اچھے تو ایسے
ویسے لوگ ہیں جو جس کا حق ہوتا ہے وہ دے تو دیتے ہیں۔ غضب خدا کا تم
زندگی میں پہلی بار آؤ اور میں تم کو جوڑے کے نام پر ایک چٹ بھی نہ دے
سکوں...میں بھیا...تیری دادی تو فقیرن ہوگئی...بھکارن ہوگئی۔ معلوم نہیں
کہاں کا زخم کھل گیا تھا وہ دھاروں دھار رو رہی تھیں۔''(۶)

جاگیردارانہ نظام کے زوال پر یہ ان کا عمدہ افسانہ ہے اس میں انہوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ فضول خرچی اور روایات کہن پر اڑے رہنے کے نتیجے میں رفتہ رفتہ یہ خاندان اقتصادی پریشانیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ قاضی عبدالستار نے اپنے اس افسانے میں قاضی انعام حسین کے خاندان کے اقتصادی دباؤ اور جذباتی الجھنوں کا ذکر بڑے پر درد انداز میں کیا ہے۔

افسانہ ''لالہ امام بخش'' ان کی ایک اہم تخلیق ہے اس میں لالہ امام کا کردار جاگیردارانہ اور مشترکہ خاندانی نظام کا پروردہ ہے۔ قاضی عبدالستار نے اس کردار کے ذریعہ ہندوستان کی سیاسی اور سماجی بدلاؤ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لالہ امام بخش پرانی قدروں سے نئے حالات کی طرف رخ کرتا ہے اور زمین و جائداد کے باوجود اس دور کی حکومتی پالیسی، پنچایتی اور پردھانی راج کے چکر میں پڑ کر جہاں اپنی جائداد کو لٹا دیتا ہے وہیں خود اس کے اندر بھی سماجی برائیاں داخل ہونے لگتی ہیں۔ دیہاتی اور شہری ماحول سے ارتباط کی وجہ سے بھی اس کے اندر بدلاؤ آتا ہے۔ وہ جب پولیس اور دیگر محکمے سے واقف ہوتا ہے تو اپنی اس واقفیت کا فائدہ اٹھا کر گاؤں والوں اور کسانوں پر اپنے رعب کو قائم کرنا چاہتا ہے لیکن چوں کہ اس دور میں شعوری طور پر لوگ بیدار ہو گئے تھے اس وجہ سے اس کے چکر میں نہیں آتے۔ لالہ امام بخش کے شہری زندگی اور سیاسی ماحول سے واقف ہونے کے بعد زمین اور جائداد سے دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ سیاسی داؤ پیچ میں ہمیشہ لگا رہتا ہے یہاں تک کہ اسی سیاست کے چکر میں قتل کا جرم بھی کرتا ہے جس کے بارے میں اس کے اسلاف کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس افسانہ کے جائزہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جمہوری نظام کے تحت بدلتے حالات اور عوام میں سیاسی و شہری تہذیب کی بصیرت سے خاندانی تہذیب و روایت اور اس کی اخلاقی قدروں میں بھی تبدیلیاں شروع ہو رہی تھیں۔

کشمیری لال ذاکر اردو افسانہ نگاری کے اہم دور سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی تخلیقات کا محور گھریلو، سماجی اور خانگی

تشدد کے ساتھ ساتھ ان کی نفسیاتی کشمکش ہے جس کو اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ انہوں نے طبقہ نسواں کے مسائل اور پیچیدگیوں کا ہر پہلو سے مشاہدہ کر کے اسے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ خاص کر متوسط اور زیریں طبقے سے تعلق رکھنے والے کرداروں کو حد درجہ سچائی اور حقیقت پسندی سے پیش کیا ہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ ''تجھے ہم ولی سمجھتے''، گھریلو سماجی اور نفسیاتی تشدد کی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اس میں خانگی زندگی کے اندر عورت کے مثبت اور منفی رویوں کو کئی زاویوں سے پیش کیا گیا ہے۔ کشمیری لال ذاکر کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ وہ افسانے کا اختتام ایسے انداز میں کرتے ہیں کہ قاری کا ذہن کچھ سوچنے کی طرف حرکت پاتا ہے اور تشنگی کے عالم میں کچھ رائے قائم کرنے اور نتیجہ نکالنے کے طرف مائل ہوتا ہے۔ وہ اس مجموعہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ''متوسط طبقے کی خواتین کے جو مسائل کچھ زندہ کرداروں کے حوالے سے مجھ تک پہونچے ہیں میں فقط ایک چھٹی رساں کے فرائض کو سر انجام دیتے ہوئے، ان مسائل کو، مختلف اوقات پر لکھی کچھ کہانیوں کی شکل، میں آپ تک پہونچا رہا ہوں۔ آپ کو یہ کہانیاں پڑھ کر، ان پر سوچنا ہوگا اور اپنی سوچ اور فکر سے ان مسائل کے حل تلاش کرنے ہوں گے۔ اگر ہم نے آج ان مسائل کے حل تلاش نہ کئے اور انہیں نظر انداز کرتے رہے تو ان کے بطن سے کئی اور مسائل پیدا ہوتے رہیں گے۔ جنہیں معاشرے میں موجود خوراک وافر ڈھنگ سے ملتی رہے گی۔ اس طرح معاشرہ ہی ان نئے نئے مسائل کی پرورش کا ذمہ دار ہوگا اور یہ مسائل وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ خطرناک اور پیچیدہ ہوتے جائیں گے۔ اور پھر ان کے حل تلاش کرنا اور بھی مشکل ہو جائے گا۔''(۷)

اگر اس مجموعہ کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں بہت سے افسانے ہمیں ایسے ملیں گے جن میں Domestic voilence اور Gender Issues کے متعدد زاویے نظر پر بحثیں موجود ہیں۔ جن کے اثرات خانگی نظام حیات اور سماج و معاشرتی زندگی پر مرتب ہوتے نظر آتے ہیں۔

ایک کامیاب مرد:۔ اس افسانہ میں انہوں نے ایک معمولی مرد کی ایک قدرے غیر معمولی عورت سے وابستگی کے بعد اس کی زندگی میں پیدا ہونے والے نشیب و فراز کا خاکہ کھینچا ہے۔ اس کا کردار پربھو دیال مہاجن ایک معمولی گھر سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کی شادی تھوڑی اونچی حیثیت والی لڑکی سے ہوتی ہے اور وہ اس کی وسیع تمناؤں اور آرزوؤں کو پوری کرنے کے لئے تجارتی ریس میں سرگرداں رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن پارٹنرشپ میں دہلی جیسے بڑے شہر میں جوتے کی فیکٹری قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اسے روس سے کئی لاکھ جوتوں کے کئی آرڈر مل

جاتے ہیں۔اس طرح وہ اپنی کامیابی کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔اس دوران اس کے دو بچے بھی ہو جاتے ہیں اور شہری طرز زندگی اختیار کر کے بچوں کی پرورش تعلیمی ماحول میں کرتا ہے۔اس کا ایک لڑکا برج موہن بڑا ہو کر الیکٹرانک انجینئر بن جاتا ہے۔ پربھودیال اس کے لئے ایک فیکٹری قائم کرنا چاہتا ہے لیکن اس کا لڑکا اس میں دلچسپی نہیں لیتا۔ وہ اپنی مرضی سے اپنے کام کا انتخاب کرتا ہے اور اپنی ہی مرضی سے شادی کر کے اپنے ماں باپ سے الگ ہو جاتا ہے۔ پربھودیال اپنے لڑکے کے اس رویے سے پریشان رہتا ہے،اسی درمیان وہ اپنی تجارت میں بھاری نقصان اٹھاتا ہے۔ کچھ دنوں بعد اسے اپنی لڑکی کی شادی کی فکر بھی لاحق ہوتی ہے۔وہ اس کی شادی کیلئے ایک میٹری مونیل میں اشتہار دیتا ہے۔چنڈی گڑھ سے ایک رشتہ بھی آتا ہے لیکن اس کی بیٹی کی شادی وہاں اس لئے نہیں ہو پاتی ہے کیونکہ اس کی بیوی لڑکے کے گھر کا جائزہ لینے کے لئے اچانک وہاں پہونچتی ہے جو لڑکے والوں کو ناگوار گزرتا ہے۔کشمیری لال ذاکر نے اپنے اس افسانے میں ایک ایسے خاندان کا ذکر کیا ہے جو ایک چھوٹے قصبے سے بڑے شہر میں آتا ہے اور یہاں سے اس کی خانگی زندگی میں بکھراؤ شروع ہو جاتا ہے۔اس کا بیٹا بھی الگ ہو جاتا ہے اور مختصر خاندان کی بنیاد ڈال کر اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ بیٹی کی شادی بھی بیوی کی غلط رویے کی وجہ سے ٹوٹ جاتی ہے جس کے صدمے میں پربھودیال کی موت بھی واقع ہو جاتی ہے۔

غرض کہ ذاکر نے خانگی نظام کے بدلتے اقدار اور ترقیاتی مقابلے کی ریس اور دولت کی ہوس میں ایک جوجھتے انسان کا منظر بیان کیا ہے اور مرکزی خاندان کی طرف نئی نسل کے بڑھتے رجحانات کے امکانات کی بھی انہوں نے بخوبی نشاندہی کی ہے خاص کر اس خاندان کی جو دیہات سے شہر کی طرف نقل مکانی کرتا ہے اور خانگی نظام زندگی سے محروم ہو جاتا ہے۔

''دوسرا موسم'' اور ''اب یہی میرا گھر ہے'' دونوں افسانوں کے موضوع کی نوعیت ایک جیسی ہے ان میں انہوں نے موجودہ دور کے اس خاندان کا ذکر ہے جس میں بزرگوں کی اہمیت ختم ہوتی جارہی ہے والدین کے تئیں بچوں کے دلوں سے محبت مفقود ہو رہی ہے۔''اب یہی میرا گھر ہے'' میں کہانی یہ ہے کہ ایک بوڑھی ماں کو اس کے چار بچے گھر سے نکال کر سمشان میں چھوڑ آتے ہیں۔''دوسرا موسم'' میں بھی ایسی ہی کہانی ہے جس میں تین بیٹے اپنی ماں کو اولڈ پیپلز ہوم کے باہر چھوڑ باہر بھاگ جاتے ہیں۔کشمیری لال ذاکر نے ان واقعات کے حقیقت پر مبنی ہونے کا بھی دعوی کیا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ موجودہ دور میں ایسے واقعات گاہے بگاہے ہمیں سننے کو بھی ملتے ہیں۔دور حاضر میں ہندوستان میں بزرگوں کو آشرم کے حوالے کرنے کا رجحان تیزی سے بڑھتا جارہا ہے۔ترقی اور شہری بے حسی کے ماحول میں ایسے واقعات کا رونما ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔کیوں کہ جب سے دیہات کے وسیع آنگن کا پھیلاؤ شہر کے محدود فلیٹ میں سمٹ آیا ہے تب سے اخلاق اور تہذیب، رشتہ داری اور قرابت داری، حسن سلوک اور حسن وفا یہ سب چیزیں ایک خاندان اور کنبے سے یوں معدوم ہوئیں جیسے کبھی ان کی حیثیت تھی ہی نہیں۔

کشمیری لال ذاکر نے دیہات، شہر، خاندان اور معاشرت کا بہت گہرا مشاہدہ اور تجربہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں جدید زمانے کے خانگی مسائل، تانیثی ترقی اور اس کی ذہنی بیداری کے ہر پہلو کی عکاسی کی ہے۔

سلام بن رزاق ۱۹۶۰ کے بعد ایک کامیاب جدید افسانہ نگار ہیں لیکن انہوں نے جدیدیت کو رجحان کی حیثیت سے نہیں بلکہ اسکے مفہوم کی گہرائی تک رسائی حاصل کر کے اس کی خصوصیات کو افسانوں میں برتا ہے۔ اور پھر جدید دور کی آلائشوں کو فنی و تکنیکی دائرے میں پرویا ہے انہوں نے اپنے افسانہ ''بجوکا'' میں دیہی زندگی کی تمدنی اور تہذیبی بکھراؤ کو بیان کرتے ہوئے شہروں کی طرف ہجرت کرنے والوں کی نفسیاتی روداد کو اس میں بیان کیا ہے۔ اس افسانے میں دو کردار ہیں شوہر اور بیوی۔ شوہر کسی شہر میں اچھی ملازمت پر ہے۔ کچھ دن بعد بیوی بھی گاؤں چھوڑ کر شہر آجاتی ہے لیکن شہری کی زندگی کی مکانکیت کی وجہ سے شوہر کے بے حد پیار کرنے کے باوجود بور ہو جاتی ہے۔ شہر کی ہمہ ہمی اسے الجھن میں ڈال دیتی ہے اور وہ زندگی سے پوری طرح اکتا جاتی ہے۔ اس اکتاہٹ سے اس کا دل چاہتا ہے کہ شوہر اسے محبت کے بجائے بری طرح پیٹے، اس کا بدن لہولہان کر دے۔ بار بار اسے گاؤں کے مناظر یاد آتے ہیں۔ کہانی کے آخر میں میاں بیوی کے پہلی بار گاؤں جانے کا منظر ہے، جہاں بیچ کھیت میں بجوکا کھڑا ہے، بیوی کے دل میں بجوکا کو پتھر مارنے کی خواہش جاگ اٹھتی ہے۔ اس طرح پوری کہانی میں افسانہ نگار نے بار بار گاؤں کی زندگی کی جھلک کو افسانے کے پردے پر دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اور دیہی و شہری زندگی کی خوشگواری و ناگواری کو بیان کیا ہے۔

آج کا شہر سماجی تبدیلیوں کا انتہائی تیزی سے بدلتا ہوا منظر ہے۔ اس کی بڑی وجہ شہری آبادی میں بے تحاشہ اضافہ ہو سکتا ہے لیکن اس کے بعد بھی اس کی ہمہ ہمی میں دیہی تہذیب کا پروردہ تمام آسودگیوں کے باوجود نفسیاتی تناؤ میں مبتلا رہتا ہے۔ سلام بن رزاق نے دیہی اور شہری اختلاط کے انہیں رویوں اور الجھنوں کو افسانوں میں علامتی اور تمثیلی پیرائے کے وسیلہ سے بیان کیا ہے۔ ان کا افسانہ 'انجام کار کی کہانی' بھی دیہی سماجی اقدار اس کے ایمانداری کے جذبے اصولی اور قانونی طرز عمل، اور شہری سماج کی برائی، غنڈہ گردی، شراب نوشی کے مثبت اور منفی رویوں کے تصادمات کو پیش کش پر مبنی ہے۔ انہوں نے یہاں پر شہری سماج کی جیت دکھلا کر دیہات یا چھوٹے شہروں سے جانے والوں میں رونما ہوتی تبدیلیوں کے عمل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستان کے تمدنی بحران کی وجہ یہ ہے کہ شہری سماج میں پرانی تہذیب و تمدن کا ساتھ چھوٹتا جاتا ہے اور نئی تہذیب کو پوری طرح قبول نہیں کیا جاتا اس لئے ہر فرد بے اطمینانی کا شکار ہوتا ہے خاندان جیسی اکائی کا زوال ہونے لگتا ہے جس کی وجہ سے ہر انسان عدم تحفظ سے خوف زدہ رہتا ہے۔

اس دور کے افسانوں کی ہیئت و ساخت اور موضوعات و مواد میں جدید نظریات اور وجودیت کے تصورات کے ابھرنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس عہد کے افسانہ نگاروں میں بھی شہر کی طرف ہجرت کرنے کا واضح رجحان پروان چڑھنے لگتا ہے۔ وہ یہاں آکر شہری زندگی کی دشواریوں اور آلودگیوں کا قریب سے مشاہدہ کرتے ہیں اور اسی زندگی کی پیچیدگیوں سے تجربات حاصل کر کے اسے اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔ غرض یہ کہ اس دور کے افسانوں میں

گاؤں سے شہر کی طرف ہجرت کرنے اور شہری و دیہی اختلاط کے ڈھیر سارے نمونے ملتے ہیں۔ان میں شہری زندگی کی سماجی پیچیدگی ،تغیر پذیری ،رسمی تعلقات کی بہتات ،خاندان کے زوال اور تیز تغیرات کی وجہ سے تہذیبی و سماجی انحراف جیسی تلخ سچائیوں کو پیش کیا گیا ہے۔

حواشی

(۱) عائشہ سلطانہ،مختصر اردو افسانے کا سماجیاتی مطالعہ (۱۹۴۷ سے تا حال)۔ص:۳۹۷

(۲) رام لعل، چراغوں کا سفر۔ص:۱۷۶

(۳) رام لعل، چراغوں کا سفر۔ص:۱۷۶۔۱۷۷

(۴) احمد یوسف، رزم یا بزم۔ص:۱۰۲۔۱۰۳

(۵) احمد یوسف، رزم یا بزم۔ص:۱۰۷۔۱۰۸

(۶) قاضی عبدالستار، آئینہ ایام۔ص:۲۲

(۷) کشمیری لال ذاکر، تجھے ہم ولی سمجھتے۔ص:۱۴

نیوکلیر فیملی کا تصور اور اس کے اقدار

خاندان کی ساخت کا مطالعہ سماجی اداروں اور دیگر سماجی اکائیوں کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ بذات خود خاندان کی تعریف مشترکہ خاندان، مرکزی خاندان یا نیوکلیر خاندان کے طور پر کی جاسکتی ہے، خواہ اس کا سربراہ مرد ہو یا کوئی عورت۔ اس میں سلسلۂ نسب مادری ہو یا پدری۔ یہ خاندان کی اندرونی ساخت کو فرائض اور ذمہ داریوں کے طور پر نشاندہی کرتے ہیں۔ جہاں تک ظاہری ہیئت وساخت کی تعریف کی بات ہے تو نیوکلیر خاندان صرف ماں، باپ اور ان کے بچوں پر مشتمل ہوتی ہے اور رہائش کے لحاظ سے مکان کی نوعیت بھی محدود اور مخصوص ہوتی ہے۔ اس کے اقدار مشترکہ خاندان سے بہت حد تک مشابہ ہوتے ہیں۔ لیکن فرائض اور ذمہ داریوں کی کیفیت محدود ہوتی ہے۔ خاندان کی ہر شکل معاشی، سیاسی، ثقافتی اور تعلیمی دائروں سے جڑی ہوتی ہے۔ اس باب کے ذیلی عنوان ''نیوکلیائی فیملی کا تصور اور اس کے اقدار'' میں ہندوستان کے تاریخی پس منظر میں اس عہد کی افسانوں کی تخلیقات کا جائزہ لیا جائے گا۔ موجودہ دور میں انسان صنعت وٹکنالوجی کی مدد سے مادی اور سائنسی اشیا زیادہ سے زیادہ پیدا کر رہا ہے اور جیسے جیسے خارجی پیداوار کی قدر و قیمت بڑھتی جارہی ہے خود انسان کی اہمیت گھٹتی جارہی ہے۔ حصول زر میں انسان اس قدر مصروف ہو گیا ہے کہ اس کے وجود کا مقصد گم ہوتا نظر آتا ہے۔ آج صنعتی ترقی میں انسان خود کو اجنبی محسوس کرنے لگا ہے۔ موجودہ سماج کا وہ طبقہ جو صنعتی ماحول سے جڑ رہا ہے اول تو وہ دیہات کو چھوڑ کر شہروں کی جانب رواں دواں ہے۔ دوم یہ کہ وہ جن قدروں ،طور طریقوں، طرز زندگی اور طرز رہائش میں پروان چڑھا ہے اسے نئے معاشرے اور نئے شہر کی تہذیب واقدار سے مطابقت پیدا کرنے میں دشواری ہورہی ہے جس کی وجہ سے دیہی زندگی سے تعلق رکھنے والا انسان وہاں کے ماحول میں نہیں ڈھل پاتا ہے۔ اس علیحدگی کے سبب اس میں اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں یہ احساس روز بروز بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ شہر میں مواقع زیادہ ہونے کی وجہ سے لوگ دیہات اور چھوٹے قصبوں سے اپنے خاندان کو خیرآباد کہہ کر شہروں کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔ ان ساری وجوہات کی بنیاد پر ان میں تنہائی، الجھن اور نفسیاتی خلجان میں شدت آرہی تھی۔

جیلانی بانو کے افسانوں میں مختلف خاندانی زندگی کے گوناں گوں مسائل نظر آتے ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی

مجموعہ ''روشنی کے مینار'' 1958 میں شائع ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی پوری تعلیم روایتی خاندان کی چہار دیواری کے اندر حاصل کی، لیکن انہیں ادبی ماحول اور علمی فضا گھر پر ہی میسر تھا۔ وہ اپنے مطالعہ کے شوق اور جذبے کی وجہ سے کم عمری میں ہی اعلیٰ پائے کے ادیبوں کی تخلیقات سے استفادہ کرتے ہوئے خود کے فنکارانہ تجربات ومشاہدات کو افسانوں میں بیان کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور اپنی تخلیقات کے ذریعہ سماج کے گوناگوں مسائل، خصوصا سرزمین حیدرآباد اور اس کے اردگرد کی معاشرتی اور سیاسی فضا، تہذیبی اور ثقافتی زندگی اور خانگی وگھریلو پیچیدگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کر رہی تھی کیونکہ ان کی ادبی زندگی کے ابتدائی دور میں ملک سیاسی انتشار اور ہنگامی صورت حال سے دوچار تھا، خاص کر حیدرآباد کی مخصوص تہذیب وروایت اور خاندان کا نظم وضبط دم توڑ رہے تھے۔ تقسیم ہند اور فسادات کے زیر اثر لاکھوں لوگ بے گھر ہو کر تہذیب وثقافت سے عاری زندگی گذار رہے تھے۔ غرض کہ اس عہد کے سیاسی، انقلابی، اقتصادی، تہذیبی خانگی، اجتماعی اور انفرادی حالات کے زیروزبر نے اس کی شخصیت اور فکر وفن کی تشکیل وتعمیر میں اہم رول ادا کیا ہے دیگر موضوعات کے مواد سے قطع نظر خاندان اور گھریلو زندگی کے مسائل اور اس میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی عکاسی ان کے افسانوں میں جا بہ جا ملتے ہیں۔ بالخصوص عورتوں کی زندگی سے متعلق حالات کے پس منظر میں انہوں نے متوسط خاندان کی مرقع کشی فنی مہارت سے کی ہے۔ ان کا افسانہ ''موم کی مریم'' اور ''سونا آنگن'' کی کہانیاں مسلم متوسط طبقے کے خاندان کے مسائل سے تعلق رکھتی ہیں اور اس میں ٹوٹنے اور بکھرنے کے عوامل کا ذکر مختلف جہتوں سے کیا گیا ہے۔ ''موم کی مریم'' میں قدسیہ کا کردار مسلم متوسط طبقے کے خاندان کی پروردہ ہے اور وہ اپنی خاندانی روایت کی پرواہ کئے بغیر آزادانہ طریقے سے زندگی گذارنے کی خواہاں ہے۔ قدسیہ ایک خاندان کی ایسی لڑکی ہے جو ماں باپ کی پسند کی شادی سے انکار کرتی ہے۔ وہ اپنی پسند کی شادی اور اپنی مرضی سے زندگی گذارتی ہے لیکن اس میں اسے کامیابی نہیں ملتی ہے۔ پورے خاندان کے لوگ اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کی اس روش کو بدچلنی پر محمول کرتے ہیں۔ اس طرح روایتی خاندان میں فرد کی آزادی کو برداشت نہ کرنے قوت اور جدید طرز زندگی کے تئیں مشترکہ خاندان میں ابھرنے والی کشمکش کے مختلف پہلو کو اس افسانے میں بیان کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی قدسیہ کی مجرمانہ بے باکی کا تجزیہ بھی اس میں موجود ہے کہ روایتی نظام کے خلاف باغیانہ عمل سے اس کی زندگی تاریک ہو جاتی ہے اور بالآخر وہ ہار مان کر زندگی کی ہر خوشی کو نظر انداز کر دیتی ہے، اس کے بعد وہ اپنی شادی چچازاد بھائی، اطہر سے، گھر کے تمام لوگوں کی مخالفت کے باوجود کر لیتی ہے جبکہ اطہر بھی ایک متوسط خاندان کا بدمعاش اور شرارتی لڑکا تھا۔ اطہر کے والد اسے گھر سے نکال دیتے ہیں اس کے بعد وہ دونوں لکھنؤ ملازمت کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ اطہر وہاں بیمار ہو جاتا ہے اور قدسیہ ملازمت اختیار کر لیتی ہے اور اپنے شوہر کی خدمت بھی کرتی ہے۔ اس کا شوہر تو ٹھیک ہو جاتا ہے لیکن وہ خود بیمار ہو جاتی ہے۔ جب اطہر کے والد اسے گھر لانے کے لئے لکھنؤ آتے ہیں اس وقت قدسیہ ٹی بی کی وجہ سے دنیا سے گذر جاتی ہے لیکن اطہر کی دنیا بدل دیتی ہے۔

اس افسانے میں جیلانی بانو نے خانگی زندگی کے ان مسائل کو پیش کیا ہے جن سے خاندان میں بدلاؤ آرہے تھے۔عورت شعوری طور پر بیدار ہورہی تھی لیکن انہوں نے اس بیداری کے نتیجے میں عورتوں کی بڑھتی ہوئی آزادی کے غلط اقدامات اور ان کے نتائج کو بیان کر کے عورتوں کی وجہ سے خاندان کی تہذیبی اور روایتی قدروں کی پامالی کی نشاندہی کی ہے اور اس قسم کی لڑکیوں کی زندگی کی عکاسی کی ہے جو خانگی نظام سے بغاوت اور آزادانہ روش اختیار کرنے میں غلو سے کام لیتی ہیں۔

ان کا افسانہ ''سونا آنگن'' بھی عورتوں کے مسائل کے ساتھ ساتھ مشترکہ خاندان کے ٹوٹنے اور بکھرنے کو پیش کرتا ہے۔اس کی کہانی یہ ہے کہ بہو بیگم اور حامد میاں ایسے والدین ہیں جن کے سات بچے ہیں۔وہ مشترکہ خاندانی نظام کے زیر اثر سب کی تربیت کرتے ہیں۔لیکن بوڑھاپے میں ایک بھی بچہ ان کے پاس نہیں رہتا ہے، ان کے سارے بیٹے اور بہوئیں جداگانہ طریقے سے مرکزی خاندان کی بنیاد ڈال چکے ہیں جو کہ منفرد جگہوں پہ مختلف امور و معاملات سے جڑ کر مختلف طریقے سے زندگی گذار رہے ہیں۔ان کے ماں باپ ایک بڑے گھر میں تنہا رہتے ہیں۔ بیٹے، بہوئیں برسوں ان کی خبر تک نہیں لینے آتے ان کی والدہ تنہائی کے ایام میں مشترکہ خانگی روایت کو ترک نہیں کرنا چاہتی اور اب بھانجے اور بھتیجیوں کے خانگی اور گھریلو مسائل سے خود کو وابستہ کرتی ہیں اور خوش رہنے کے طریقے تلاش کرتی ہیں۔رضیہ ان کی ایک بھتیجی ہے، جس کا شوہر اسے بانجھ کہہ کر دوسرا نکاح کر لیتا ہے۔وہ اپنی پھوپی بہو بیگم کے پاس آکر اپنی حالت سناتی ہے۔ بہو بیگم کے خانگی نظام کے ٹوٹنے کا احساس و کرب ان الفاظ سے نمایاں ہوتا ہے۔ جب وہ اپنی بدقسمتی پر رضیہ سے لپٹ کر کہتی ہے۔

> ''بانجھ۔!''بہو بیگم کے سینے پر یہ لفظ سل بن کر گرا اور رگ رگ کو کچل گیا۔انہوں نے اپنے بھائیں بھائیں کرتے خالّی گھر کو دیکھا اور پھر حامد صاحب کو جو کھانستے کھانستے ڈگمگاتے قدموں سے اٹھ کر پانی پی رہے تھے۔
>
> اچانک بہو بیگم کو ایسا لگا کہ وہ خود بھی بانجھ ہیں۔ان کی کوکھ سے اب تک کوئی کونپل نہیں پھوٹی۔انہوں نے اس اندھیرے گھر میں روشنی پیدا کرنے والا کوئی بچہ پیدا نہیں کیا۔پھر اپنی بدنصیبی پر وہ رضیہ سے لپٹ کر یوں روئیں جیسے ان آنسوؤں میں ڈوب مریں گی۔
>
> ''رضیہ بیٹی، میری گڑیا۔صبر کر''۔پر میں دل ہی دل میں بولیں۔ مجھے دیکھ جو بانجھ سے بھی بدتر ہے۔دیکھ، دیکھ...''(۱)

جیلانی بانو نے اس افسانے میں مشترکہ خاندان کے بکھراؤ کے عمل اور بزرگوں کی بے بسی کو حقیقی طور سے واضح کیا ہے۔نیوکلیر فیملی کا تصور و قدر کی جھلکیاں اور ان میں پیدا ہونے والے طلاق اور نکاح کے مسائل بھی اس میں موجود ہیں۔

طارق چھتاری نے ثقافتی سروکاروں کی مختلف جہتوں کو آشکار کرنے کے لئے آزاد ہندوستان کے اندر نمودار ہونے والی سماجی اور تہذیبی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ انسانی کرب ناکیوں کو افسانوی ڈسکورس کے قالب میں ڈھالا ہے۔ان کا افسانوی مجموعہ ''باغ کا دروازہ'' میں شامل اکثر افسانوں کے موضوعات مغربی اور مقامی تہذیب کے متضاد اور مخالف رویوں سے وابستہ ہے۔خاص کر آزاد ہندوستان میں آئینی اعتبار سے سماج اور جائداد میں اصلاحات کے منصوبے اور ترقیات کے نتیجے میں فرد اور جماعت گھر اور خاندان کے اندر پیدا ہونے والے خیالات کی آئینہ داری ان کے افسانوں میں مختلف پہلوؤں سے اجاگر ہوتے ہیں۔

''آدھی سیڑھیاں''، ''نیم پلیٹ''، ''شیشہ کی کرچیں''، ''صبح کاذب''، دس بیگھے کھیت'' ان کے ایسے افسانے ہیں جن میں نئی اور پرانی نسل کی سوچ، قصبہ اور شہر کے تصادم، عصر حاضر کے وہ ازدواجی رشتے کہ جن میں خارجی تال میل تو ہوتی ہے لیکن ذہنی ہم آہنگی نہیں ہوتی، فطری عروج وزوال دونسلوں کے درمیان فرق وامتیاز اور حکومت کی نئی آراضی پالیسی جس میں زمین کی ملکیت کی حد بندی ہوتی ہے اور جس کے نتیجے میں ہندوستان کے اندر سماج اور خاندان میں بڑی تبدیلی آتی ہے۔یہ سارے مسائل کا انتخاب بطور موضوع کیا گیا ہے۔

افسانہ ''شیشہ کی کرچیں'' میں جوہری خاندان سے وابستہ عصر حاضر کی ازدواجی زندگی کا احاطہ کیا گیا ہے۔جس میں شوہر وبیوی اچھی ملازمت کرتے ہیں، آسائش کا ہر سامان موجود ہے لیکن ان میں ذہنی اور فکری ہم آہنگی قائم نہیں ہو پاتی ہے۔

''آدھی سیڑھیاں'' میں بھی ترقی پسندی اور رجعت پسندی کے تصادم کے تناظر میں شہری زندگی اور خاندانی پہلوؤں کو ہر جہت سے پیش کیا گیا ہے۔اس افسانہ کا مرکزی کردار ایک عورت ہے جو نئی اور پرانی نسلوں کی فکری فرق اور تصادم کی وجہ سے نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔افسانہ نگار نے اس عورت کے وسیلے سے دور حاضر کی بے پناہی، شہری سماج کی آپ بیتی، نیوکلیئر فیملی میں زندگی گذارنے والوں کی تصویر کشی اور گہرے مشاہدے سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا گیا ہے۔

اسی طرح وہ اپنے افسانہ صبح کاذب میں دونسلوں کی کہانی بیان کرتے ہیں۔تو جدید ہندوستان میں بیسویں صدی کے آخری زمانے میں جب تبدیلیوں کی باڑھ آتی ہے۔ہندوستان میں خاص کر دسویں دہائی کے بعد تجارتی اور صنعت کاری کا جال اتنی تیزی سے پھیل رہا تھا کہ سماجی زندگی بڑی تیزی سے اس کے لپیٹ میں آرہی تھی، جہاں بڑی بڑی صنعتیں قائم ہورہی تھیں وہاں نئی نئی بستیاں آباد ہورہی تھیں۔محنت کش کی ہجرت کی وجہ سے بے شمار مسائل پیدا ہو رہے تھے۔مشترکہ خاندان کی شکلیں مختصر ہورہی تھیں یعنی مرکزی خاندان کا تصور صنعتی مزدوروں پر چھا رہا تھا، صنعتوں میں کام کرنے والے یہ افراد مختلف مذاہب، زبانوں، ثقافتوں اور خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے جس کی وجہ سے نئے ماحول میں ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کرنے میں بہت سی دشواریاں پیدا ہورہی تھیں۔زیادہ تر افراد اجنبیت کی وجہ سے استحصال اور دوسرے مسائل میں گھر جاتے تھے۔

غرض یہ کہ طارق چھتاری نے اپنے افسانوں کے ذریعہ صنعتی، شہری اور مختصر خانگی زندگی کے ماحول ومسائل کی مختلف جہتوں کو واضح کیا ہے جس سے کہ تغیر پذیر سماجی و خانگی اقدار اور انسانی فطرت میں ہم آہنگی کے امکانات کے دروازے وا ہو سکتے ہیں۔

واجدہ تبسم بڑے بڑے شہروں کی زندگی اور اس کے مختلف پہلو کے ساتھ ساتھ ہماری عام تہذیب اور شائستگی کے نشیب وفراز اور جاگیردارانہ نظام کی زوال پذیر کیفیت کو اپنے افسانوں مین بیان کرتی ہیں۔ گاؤں کے کسانوں کی خانگی اور سماجی تہذیب وتمدن میں آنے والے ہمہ جہتی انقلابی تغیرات ماجدہ تبسم کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔ خاص مسلم متوسط طبقے کے ایسے خاندان جن میں لڑکیوں کے لئے تعلیم اور ملازمت کے دروازے بند تھے۔ ان کا بے پردہ باہر نکلنا معیوب سمجھا جاتا تھا لیکن نئے دور میں نئے طور طریقے ابھرے اور ان میں سماجی اور خانگی وقار اور معیار قائم کرنے کی شعوری بیداری پیدا ہوئی۔ اس کی بنیاد پر جو مثبت اور منفی اثرات مسلم معاشرے اور خاندان پر مرتب ہوئے ،واجدہ تبسم نے اپنے افسانوں کے ذریعہ ان سارے مسائل کو بیان کیا ہے۔ ''نتھ کا بوجھ'' گلستان سے قبرستان تک''، ''اترن''، ''شہر ممنوع''، ''دیار حبیب''، تخت طاؤس''، ''ساتواں شہزادہ'' ان افسانوں میں ایسے ہی موضوعات ہیں جس کا تعلق سماج، خاندان اور فرد کے درمیان، نئے اور پرانے قدروں کے تصادمات اور مفاہمت کی کئی صورتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں اور ان صورتوں میں خاندانی اکائی کی ٹوٹ پھوٹ کا عکس بہر طور جھلکتا ہے۔

''گلستان سے قبرستان تک'' اس میں جاگیردارانہ خاندان کی تہذیب کی زوال پذیری کو موضوع بنا کر اسے ماضی اور حال کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ گلستان ماضی کی پروقار عمارت کی علامت ہے لیکن وہ عمارت اور اس کے مکین حال کی کرب ناکیوں سے دوچار ہیں، حالات نے گھریلو زندگی کو معاشی بحران میں مبتلا کر کے جاگیردارانہ خاندان کی شان وشوکت پر ایسی کاری ضرب لگائی ہے کہ وہ خاندان جس کے پروردہ دوسروں کی نوکری کرنا غلامی تصور کرتے تھے آج ان میں سے ایک فرد ''منو چچا'' اپنی سماجی اور خاندانی روایتوں سے وابستہ شان وشوکت کو بھول کر شہر کی طرف ملازمت کی غرض سے روانہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد منو چچا شہری طرز زندگی میں ڈھل کر اپنی بیوی بچوں کے ساتھ نیوکلیر فیملی کے تحت زندگی گذارنے لگتا ہے۔

غرض کہ واجدہ تبسم نے اس افسانے کے ذریعہ جاگیردارانہ طبقے کی خانگی نظم وضبط کے بکھراؤ کا بڑا پرسوز نقشہ کھینچا ہے اور ہندوستان کے بہت ساری خاندانوں کی معاشی مسائل جس پر خانگی زندگی کی بنیادیں قائم ہیں، اس کے مثبت اور منفی اثرات جدید ہندستان میں خاندان پر کس طرح مرتب ہوئے اس کی عکاسی مختلف زاویئے کی ہے۔

اقبال انصاری نئے لکھنے والوں میں ایک ایسے افسانہ نگار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں جن کے افسانوں میں موجودہ زندگی کی گہری بصیرت بھی ہے اور فنی لوازم کو سلیقے سے برتنے کا شعور بھی۔ انہوں نے موضوع کے انتخاب، فنی رسوم کے التزام اور اپنے مقصد کے اظہار کے دوران اس پہلو کو سامنے ضرور رکھا ہے کہ پڑھنے والے کے ذہن میں کوئی

نہ کوئی نقش مرتسم ہو جائے۔ ہر کامیاب افسانے کی اصل کسوٹی اس کا مجموعی تاثر ہوتا ہے۔ اقبال انصاری کے افسانے اس کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے مجموعی تاثر کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی خانگی زندگی اور سماجی اقدار گتھی ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور خاندان وسماج کی یہ گتھی چوں کہ زندگی کی کسی نہ کسی قدر سے وابستہ ہوتی ہے اس لئے حیات انسانی کی گہری بصیرت کی ترجمانی بھی کرتی ہے۔ اقبال انصاری نے دورِ نو کے معاشرے کی خانگی زندگی کی محرومیوں اور الجھنوں کو غور وفکر کے ساتھ دیکھنے اور پرکھنے کے بعد ہی اپنے افسانے میں قلم بند کیا ہے۔

اقبال انصاری کے افسانوں کا مجموعہ ''گھر'' میں ایسے متعدد افسانے موجود ہیں جن کے موضوعات خانگی زندگی کی سمٹتی ہوئی ساخت کے کسی نہ کسی پہلو سے مربوط ہیں ان کے اکثر افسانے صاف اور سادہ اسلوب کے حامل ہیں اور ان کے کرداروں کے ذریعہ عام طور پر خانگی زندگی اور گھریلو مسائل کی پیچیدگیوں کی نقاب کشائی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عصری سچائیوں سے پنپنے والے تاثرات جس سے کہ خانگی زندگی میں بدلاؤ کی صورت پیدا ہوئی اور مشترکہ خاندان نیوکلیر فیملی میں سمٹنے لگا، اس صورت حال کا عکس ان افسانوں میں ملتا ہے۔

ماہ صیام:۔ اس افسانہ میں اقبال انصاری نے نہ صرف روایتی خاندان کے مرکزی خاندان میں تبدیل ہونے کے عمل کو بیان کیا ہے بلکہ ایک ایسے مرکزی خاندان کی حالت بیان کی ہے جس میں مرد تعلیمی توسط سے ترقیاتی مراحل طے کرتا جاتا ہے اور ماضی کی روایتوں سے دور ہوتا جاتا ہے۔ انفرادی آزادی کا خیال ہے لیکن اس سے دوسرے کی خواہش کس طرح مجروح ہوئی ہے اس کا کوئی خیال نہیں۔ اس افسانہ کا ایک کردار اکرم اپنی چچازاد بہن ملکہ سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن چوں کہ مشترکہ خاندان کے تحت زندگی گذار رہا ہوتا ہے اس لئے وہ کامیاب نہیں ہوتا ہے۔

> ''جب اکرم نے اپنا عندیہ ظاہر کیا تو پہلے تو اکرم کے والد بھونچکے رہ گئے۔ پھر جا کر گھر کا دروازہ کھولا، اور بولے، اس دروازے سے نکل کر اس گھر سے جا تو سکتے ہو ملکہ سے شادی کرنے۔ لیکن اس بے ہودی اور خاصی نامور ماں کی اس سے زیادہ بے ہودی اور زیادہ نامور لڑکی سے شادی کر کے اس دروازے سے کبھی اس گھر میں واپس آ نہیں سکو گے۔ عاق کردوں گا۔''(۲)

چونکہ یہ رشتہ مشترکہ خاندانی نظام کے اعتبار سے مناسب نہیں تھا اس لئے اکرم کی خواہش پوری نہیں ہوتی اور کنیز فاطمہ سے اس کی شادی ہو جاتی ہے۔ ملکہ عبداللہ سے شادی کر لیتی ہے۔ اس اقتباس سے مشترکہ خاندانی نظام کی خامیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اس نظام میں فرد کی انفرادیت کوئی اہمیت نہیں رکھتی، وہ ہر معاملے میں اس کی روایت کا محکوم ہوتا ہے۔ لوگوں میں نیوکلیر فیملی کے رجحان کو بڑھاوا دینے کا ایک بڑا سبب مشترکہ خاندان کا یہ تحکمانہ رویہ ہے۔ اکرم کے والد کے انتقال کے بعد اس طرح کا رجحان پروان چڑھتا ہے۔ اکرم سرکاری عہدہ پر فائز ہوتا ہے

اور کلرک سے ترقی کرتے ہوئے رئیس بن جاتا ہے اب اس کی زندگی میں نئے اقدار کی مداخلت ہوتی ہے اور وہ آزادانہ طریقے سے اپنی شریک حیات کے ہوتے ہوئے اسی ملکہ کے ساتھ مخفی طور پر رہنے لگتا ہے کیونکہ ملکہ کا شوہر چھ ماہ بعد ہی ایک ٹرک کے نیچے آکر موت کا شکار ہو جاتا ہے۔

''اکرم وزارت نقل وحمل میں ہیڈ کلرک ہو گئے، پھر محکمہ جاتی امتحانات امتیاز کے ساتھ پاس کرتے چلے گئے۔ ترقی ہوئی چلی گئی اور اب جے ایس تھے۔ مجھ سے انہیں کبھی کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی، چوری چھپے ملکہ کے ساتھ وقت گذارا کرتے تھے ایک بیٹی میں چوں کہ خود یونیورسٹی میں لکچرر تھی اور اب تو ریڈر ہو گئی تھی اس لئے میں نے بیٹی کو سناور کے لارنس پبلک اسکول میں ڈال دیا تھا۔ نہ ڈالتی تو کیا کرتی؟۔ اس کی دیکھ بھال کون کرتا؟ میں یونیورسٹی میں ملازم تھی۔ اکرم جب سے جے ایس ہوئے تھے۔ مہینے میں بائیس پچیس دن ٹور پر رہتے تھے۔ کبھی کلکتہ، کبھی پیرادیب، کبھی وشاکھا پٹنم، کبھی ٹیوٹی کورن، کبھی کوچین، یہ پانچ بندرگاہ ان کے چارج میں تھے۔ اس لئے ان کا زیادہ وقت ٹور پر ہی گزرتا تھا ملکہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی تھی۔ مجھے اس کا علم تھا لیکن کیا کر سکتی تھی؟ مرد ٹھہرا زبردست، اب تو ان کے والد کا انتقال بھی ہو چکا تھا کوئی دھمکانے والا بھی نہیں تھا۔ ایک بار میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی اکرم نے فوراً دوٹوک کہا ''ملکہ نہیں چھوٹ سکتی، تم جب چاہو، تمہیں طلاق دے دوں۔'' میں سناٹے میں آ گئی۔ میں نے پھر کہنا چاہا مگر... اکرم کے جملے نے رہے سہے حوصلے بھی پست کر دیئے۔ ''اگر میں یوں ہی ملکہ کو یہاں لا کر رکھ لوں تو کیا کر لوگی؟ خاموشی بہتر ہے۔ مجھے اپنی زندگی جینے دو۔'' میں خاموش ہو گئی۔'' (۳)

اس اقتباس کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خاندان کے ادارے میں تبدیلی کی نوعیت صرف اس کی ساخت میں تبدیلی تک محدود نہیں بلکہ خاندان کے مقاصد اور اس کی قدروں میں بھی تغیرات ہو رہے ہیں یعنی جب اکثر لوگ ایک گھر میں پورے کنبے کی حیثیت سے رہتے تھے ان کے اقدار بھی اجتماعی نوعیت کے تھے اور اس سے انحراف کی جرأت فرد واحد میں نہیں تھی۔ لیکن جب مرکزی خاندان کا تصور عام ہوا تو اولاً جو لوگوں کو بڑے کنبوں کی شکل میں رہنا پسند نہیں آیا دوم یہ کہ اس کے اقدار بھی فرد کے چاروں طرف مرکوز ہو گئی ہیں۔ جذبۂ ایثار، وفاداری، اخلاق کی پابندی اور ازدواجی رشتے کی خوش اسلوبی جو مشترکہ خاندان کی علامت تھی مٹنے لگی اور مرکزی خاندان ان علامتوں سے یکسر خالی

گیا۔اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اقبال انصاری کا یہ افسانہ نیوکلیر خاندان کے عبوری مراحل کی بخوبی عکاسی کرتا ہے۔ ان کے افسانے ''صاحب''، ''جھٹکا''، ''بچے''، ''ستار بھائی''، ''کنیز''، ''وہ ایک غلطی'' میں ایسی کہانیاں ہیں جس میں خاندان اور اس کے اقدار کی تبدیلی، روایتی اور جدید اقدار کے تصادم، تہذیبی اور تعلیمی تضادات، نسلوں کی قربتوں اور فاصلوں کا بیان کسی نہ کسی طور پر موجود ہیں جن سے مرکزی خاندان کے اقدار و تصورات کی عکاسی ہوتی ہے۔

اقبال متین نے بھی خاندانی قدروں کے زوال اور معاشرے کی اخلاقی پامالی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے ۔وہ اپنی ایک کہانی ''پو پھوٹنے تک'' میں ایک ایسے گھر کی عکاسی کرتے ہیں جس میں ایک نچلا خاندان اپنے کئی بھائیوں اور ماں باپ کے ساتھ چھوٹی سے کٹیا میں زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے۔اقتصادی حالات اچھے نہ ہونے کی بنا پر بڑے مکان کا تصور ان کے نزدیک ممکن نہیں۔ ماں باپ اپنی بہت سی اولادوں کو پیدا کر کے اور پھر ان کی شادیاں کر کے زندگی کے بقیہ دن گذار رہے ہیں۔لڑکے کسی نہ کسی طرح اپنی بیویوں کے ساتھ رات کے اندھیروں میں جنسی تسکین حاصل کیا کرتے ہیں ایک لڑکی جواب جوان ہو رہی ہے اکثر رات کو ایک ہی کٹیا میں اپنے بھائیوں کو بھابھی کے ساتھ لپٹا ہوا دیکھا کرتی ہے۔ایک رات بارش کی زیادتی کی وجہ سے سب اندھیرے میں پڑے رہتے ہیں اور انہیں اس بات کا بھی ہوش نہیں رہتا ہے کہ جن عورتوں کے ساتھ وہ ہم آغوش ہوتے ہیں وہ ان کی بیویاں ہیں بھی یا نہیں۔رات کا یہ منظر گھر کی کنواری پوجی دیکھ لیتی ہے اور اسے یہ پتا ہوتا ہے کہ رات اس کی بھابھیاں جن کے ساتھ لیٹی تھیں وہ ان کے اپنے شوہر نہ تھے۔ایک اقتباس میں متین نے ایسے گھر کی عکاسی کچھ اس طرح کی ہے۔

> ''ایک رات طوفانی بارش تھی، سیلی ہوئی زمین بھیگی ہوئی کچی دیواروں اور چھپر کے درمیان تیز تیز سانسوں کی گرمی اور حدت بھی جیسے ٹھٹھر رہی تھی۔ بوسیدہ کمبلوں اور چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے انسانی جسم ایک دوسرے میں اپنی حرارت منتقل کر کے ٹھنڈی اور یخ بستہ رات کو جھٹلانے کی ناکام کوشش میں اپنے گرم گرم جسم اور سانسوں کی حدت کے سہارے سیلی ہوئی زمین پر سکڑ رہے تھے۔ اور رات آہستہ آہستہ بڑی گمبھیر ہوتی جا رہی تھی۔'' (۴)

مختصر سے اس افسانے میں کثرت اولاد اور اس سے پیدا ہونے والی دشواریوں، پریشانیوں اور شرمندگیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ جو ہمارے آج کے تصور کا اہم مسئلہ ہے۔اور یہی مسئلہ افسانہ کا موضوع ہے۔غریبی پہلے بھی تھی کٹیا کا وجود پہلے بھی تھا اور کثرت اولاد کے سبب بھوک اور افلاس کی مشکلات سے لوگ پہلے بھی دوچار تھے مگر پھر بھی پرانے افسانہ نگاروں نے ایسے کسی ماحول کو پیش نہیں کیا جہاں جوان بیٹے اپنی بیویوں کے ساتھ اس کی ایک کوٹھری میں ماں باپ دوسرے بھائیوں اور کنواری بیٹیوں کی موجودگی میں جنسی خواہش کی تکمیل میں جھجک محسوس نہ کرتے

ہوں۔مگر آج ادیب کے سامنے ایسے گھر موجود ہیں جہاں ایسا ہوتا ہے۔خاص کر شہری منظر ناموں پر بسنے والے ایسے بہت سارے خاندان ہیں جو تنگ و تاریک گھروں میں زندگی گذارتے ہیں۔

اقبال متین کے افسانوں کے موضوعات زمین سے قربت کا احساس دلاتے ہیں۔ ہمارے دور کی وہ نئی ابھرتی ہوئی آواز جو پہلے بے آواز نظر آتی تھیں اب ان کی چیخ صاف سنائی دیتی ہے۔اس دور کا شہر آشوب ان کی کہانیوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

عہد جدید میں مجرد اور بے ربط کہانیاں لکھی جارہی تھی، ساتویں دہائی کے بعد اس میں بیانیہ طرز اور مربوط ہیئت کی واپسی ہوتی ہے اس دور میں جن افسانہ نگاروں نے کہانی کے طرز واپسی کی ہے ان میں سید محمد اشرف کا نام بھی سر فہرست ہے۔قدروں کا زوال تہذیبی بکھراؤ اور رشتے ومحبت کے جذبات میں کمزوری ان کے اہم موضوعات ہیں۔ ساتھ ہی نجات، چمک، بادصبا کا انتظار ان ساری کہانیوں میں زندگی سماج اور خاندان کے روشن اور تاریک پہلو کو براہ راست تو نہیں مگر بالواسطہ پور بیان کیا گیا ہے۔عصر حاضر کی تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا کے تئیں ان کا فکر وشعور نئے طرز سے افسانوں میں ابھر کر سامنے آیا ہے۔

> ''انہوں نے تہذیب کو تاریخ کی باہمی تعامل ہندوستانی پس منظر میں ان سے متعلق رونما ہونے والیے حادثات اور ان کے اثرات کو بڑی خوبصورتی سے فن کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔اس پر بھی اکثر ناقدین اتفاق کرتے ہیں کہ اشرف نے قصباتی زندگی، جگماتے شہروں اور ان میں رہنے والوں کی کلفتوں کو محسوس کرتے ہوئے روزمرہ کی زندگی کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھا ہے۔جہاں ایک نئی دنیا آباد ہے۔''(۵)

افسانہ نجات نچلے متوسط طبقہ کی ناگفتہ بہ حالت کا ایک ایسا علامتی بیان ہے جس میں مسلم سماج اور خاندان کے اندر تعلیم کی کمی کی وجہ سے بڑھتے مسائل ابھر کر سامنے آئے ہیں۔خاص کر وہ خاندان جہاں بھوک، افلاس، مزدوری اور بے روزگاری کے سبب پوری زندگی جدوجہد میں گذرتی ہے لیکن ضروریات کی بھرپائی پھر بھی نہیں ہو پاتی ایسے خاندان سے وابستہ افراد شب وروز کی محنت کے باوجود سماج میں حاشیے پر رہتے ہیں۔اس طرح کبھی کبھی ان میں اپنی ساکھ بچانے کے جذبات ابھرتے ہیں۔اس کے بعد شہرون میں جاکر مواقع کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ملازمت کے بعد بیوی اور بچوں کے ہمراہ شہری زندگی کی ہمہ ہمی میں گم ہو جاتے ہیں۔معاشی حالات بہتر ہونے کے بعد ان میں تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔اس کہانی میں ایوب کا کردار، مرکزی کردار کی حیثیت رکھتا ہے اس کی پیدائش سے لیکر اس کی موت تک کی داستان اس افسانے میں پھیلی ہوئی ہے۔جس کے پس منظر میں مشترکہ خاندان، رشتے اور قرابت داری کی اہمیت وافادیت کو بیان کرتے ہوئے موجودہ دور کی خانگی زندگی کا مختلف پہلوؤں کا جائزہ پیش کیا ہے۔

کعبے کا ہرن اس افسانہ میں زمیندار موجودہ حالات سے سمجھوتہ کرتے نظر آتے ہیں۔ سید محمد اشرف نے اس میں زمینداری کے خاتمہ کے بعد ان کی خستہ حال زندگی کی عکاسی کی ہے۔ اس افسانہ کے اہم کردار امیر میاں ہیں جن کی زمین آزادی کے بعد ضبط کر لی گئی ہے اور جو تھوڑی بہت رہ گئی ہے وہ ان کے شان و دبدبہ کو باقی رکھنے کے لئے ناکافی ہے۔ امیر میاں وقت کی رفتار کو دیکھتے ہوئے شہر کا رخ کرتے ہیں اور ماضی کو بھول کر مستقبل کی فکر کا حوصلہ کرتے ہیں۔

''امیر میاں بہت ہوشیار آدمی تھے۔ زمینداری کے زمانے میں وہ دنیا کی تمام اونچ نیچ دیکھ چکے تھے۔ وہ زمانے سازی کے فن جانتے تھے۔ اگر اس فن سے ناواقف ہوتے تو شاید زمینداری ختم ہو جانے کے بعد گاؤں چھوڑ کر شہر جو جھنے نہ آتے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر باقی زندگی گاؤں میں بسر کی تو ان کے لڑکے بڑے ہو کر یا مرغ بازی کریں گے یا گاؤں کی لڑکیوں کو چھیڑیں گے۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی سوچا کہ ابھی تو سیر کی آمدنی آتی ہے لیکن جب یہ لڑکے بڑے ہوں گے تو یہی آمدنی چار جگہ تقسیم ہو جائے گی اور سب کے حصہ میں دھیلہ دھیلہ آئے گا۔ اور تبھی انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ شہر جا کر بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلائیں گے۔''(۶)

اس اقتباس سے دیہات سے شہر کی طرف ہجرت کا عمدہ بیان ہے انہوں نے خاصوں کی زندگی کو بھی بدلتے ہوئے دکھایا ہے۔

سید محمد اشرف اپنے اکثر افسانوں میں جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام کے خاتمہ کی تصویر کشی فنی تلازمات کے ساتھ کرتے ہیں۔ مگر اس افسانے میں آن بان اور شان و شوکت کو بچانے کے لئے جھوٹی اور مصنوعی کوششوں پر انہوں نے زیادہ زور دیا ہے۔ زمیندارانہ نظام کے خاتمہ پر لکھے گئے دوسرے افسانوں سے ان کا یہ افسانہ مختلف ہے اس میں انہوں نے شہروں کی طرف ان کی ہجرت، موجودہ زندگی کے نئے تقاضوں سے وابستگی، نئی تعلیمی بیداری سے رغبت اور نیوکلیر فیملی کے اقدار و تصورات ان سارے عناصر اور ان سے وابستہ مسائل کو بیان کیا ہے۔ آزادی کے بعد زمینداروں میں ملازمت اور شہری زندگی کے بڑھتے رجحان اور اس کے بعد خاندان کی ہیئت و ساخت اور فرائض اور ذمہ داریوں کے بدلتے منظر ناموں کو اپنے افسانوں کے ذریعے اجاگر کیا ہے۔

رضوان احمد کی افسانہ نگاری مرکزی فیملی اور شہروں میں رہنے والی فلیٹوں کی زندگی کے ناخوش گوار اور چبھتے ہوئے لمحات کی پیداوار ہے۔ رضوان احمد کے افسانوں میں زیادہ تر تجریدی فضا کا منظر ہے۔ جو اندرونی اور داخلی دنیا کی کشمکش سے آباد دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اس کے تحت خارجی حالات کے اثرات سے پیدا ہونے والی شہری زندگی کی تبدیلیوں کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ ''مسدود راہ، راہوں کے مسافر'' میں جہاں علامتوں اور استعاروں کی کثرت ہے،

وہیں ایک دوسرا مجموعہ طوفان کی زد پر میں سماجی، سیاسی اور خانگی زندگی کی حقیقت کے مرقعے ہیں۔ افسانہ اب یہاں نہیں رہنا ہے میں سماجی اور معاشرتی طور پر شہروں میں ہونے والے نمایاں فرق کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کی کہانی یہ ہے کہ اس کا ایک کردار جو کلرک ہے، چھوٹی آبادی سے شہر کی طرف آیا ہے، اس کو اس وقت شہری سماج عجیب معلوم ہوتا ہے۔ جب پڑوس میں کسی کی موت ہو جاتی ہے اور اس کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی خبر دی جاتی ہے۔ اسی طرح میت کی تجہیز و تکفین کر دی جاتی ہے۔ اس المیے کی اصل وجہ شہری ماحول اس کی مصروفیت اور سماجی بے حسی دونوں کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

''دراصل اس میں عجیب کچھ بھی نہیں ہے، دیکھیے میں اپارٹمنٹ میں رہتا ہوں۔ دفتر آنے کے لیے میں صبح اندھیرے ہی بس پکڑ لیتا ہوں۔ پھر رات دیر گئے واپس جاتا ہوں۔ اس دوران میرے بیوی بچے کیا کرتے ہیں، اس کی خبر نہیں ہوتی۔ اور پڑوسیوں سے تو ہفتوں اور مہینوں کے بعد ملاقات ہوتی ہے۔ تعطیل کا دن بھی اکثر چھٹی کا دن نہیں ہوتا۔ بلکہ زیادہ ہی مصروفیت کا دن ہوتا ہے۔ کیوں کہ ساری مصروفیات کو اسی دن کے لیے اٹھا کر رکھی جاتی ہے۔ وقت کیسے گزر جاتا ہے کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔''(۷)

اس اقتباس میں شہر زندگی اور نیوکلیر فیملی کے انقطاع روابط کو کاروباری مصروفیت کے تناظر میں دکھایا گیا ہے۔ جب وہ اپنی مصروفیت اور میت کی تجہیز و تکفین پر افسوس کا اظہار کرتا ہے تو اسی وقت دفتر کا ایک دوسرا کردار مکل شہری سماج کی بے حسی کی ایک الگ داستان سناتا ہے۔

''مکل نے کہا دیکھیے بات یہ ہے کہ آج حالات بہت عجیب ہیں۔ میں جس اپارٹمنٹ میں رہتا ہوں وہ دس منزلہ ہے میں اس کی چوتھی منزل پر رہتا ہوں ہماری تیسرے منزل کے ایک صاحب اچانک چل بسے۔ نوجوان اچھے خاصے ہٹے کٹے تھے۔ تنہا رہتے تھے۔ کسی کو ان کی موت کے بارے میں پتہ بھی نہیں چل سکا۔ تین دنوں تک فلیٹ سے نہیں نکلے۔ دروازہ تک نہیں کھلا۔ مگر کسی کو احساس تک نہیں ہوا کہ ان کی خیر خبر لیں۔ جب لاش سڑ گئی اور بدبو پوری فضا میں پھیلی تو لوگوں کو احساس ہوا کہ اب وہ نہیں رہے۔ مگر یہ کیا زندگی ہے کہ کسی کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔ صرف ایک پتلی سے دیوار کا فاصلہ ہے لیکن کتنی زیادہ دوری ہے۔ صرف ایک چھت کا فاصلہ ہے مگر کوئی لگاؤ نہیں۔ پہلے مکان دور دور تھے، مگر دل کتنے قریب تھے۔ آخر ہمیں کیا ہو گیا ہے، کیا ہم انسان نہیں ہیں۔''(۸)

اس اقتباس سے بھی شہری سماج کی کاروباری دنیا کی ہوس نا کی عیاں ہوتی ہے۔خاندانی تحفظ کی دیواریں منہدم ہورہی ہیں۔اور آج ہم ایسے ملبے پر تھکے ہارے کھڑے ہیں کہ زندگی اور مستقبل کے کوئی آشیانے نظر نہیں آتے۔اس افسانے کے آخری حصے میں بھی شہری سماج کی غیر محفوظ زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔

''وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور کمرے پر طائرانہ نظر ڈالی سب طرف سامان بے ترتیب پڑا ہوا تھا۔'' احمد صاحب ایسا ہے کہ ہم لوگ اس مکان سے جارہے ہیں دوسری جگہ منتقل ہورہے ہیں۔

لیکن کیوں؟اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

بات یوں ہے کہ گذشتہ روز میرے گھر دن دہاڑے ڈاکہ پڑا اردگرد کے سب لوگ دیکھ رہے تھے،لیکن کوئی کچھ نہیں بولا۔ڈاکوؤں نے گولیاں چلائیں میرے بیٹے کو زخمی کردیا میری بیوی، بیٹی مدد کے لئے چلاتی رہے لیکن کوئی نہیں آیا ڈاکو سب کچھ لے کر فرار ہوگئے۔''(۹)

جدید دور میں فلیٹ میں سمٹی ہوئے سماج کی بے بسی کی ایک مثال اس اقتباس سے قائم کی جاسکتی ہے۔اس طرح کی مثالیں آئے دن خبروں میں آتی رہتی ہیں کہ فلیٹ میں چوری ہوگئی، بچے غائب ہوگئے اس کے علاوہ دیگر مسائل جن سے آج کی مختصر فیملی دوچار ہے۔رضوان احمد نے نیوکلیر فیملی کی انھی تلخیوں کو اس میں بیان کیا ہے کہ جب سے آنگن کا پھیلاؤ شہروں کی تنگ گلیوں اور فلیٹوں میں سمٹ آیا ہے تب سے اخلاق، اقدار، تہذیب، رشتہ داری، قرابت داری اور آداب یہ ساری چیزیں سماج سے یوں معدوم ہوئیں جیسے کبھی ان کی کوئی حیثیت تھی ہی نہیں۔آج ہم اپنے آپ کو ترقی یافتہ کہہ کر جشن منارہے ہیں لیکن ان تلخ سچائیوں کو نہیں بھلایا جاسکتا کہ سماج کا تانا بانا اب ڈھیر ہوچکا ہے، خاندان اور رشتوں کی وسعت سمٹ چکی ہے۔اب والدین کی وہ آنکھیں کہاں جو اولاد کے لئے بچھی رہتی ہوں، بہنوں کی وہ محبت کہاں جو بھائیوں کو ترساتی رہتی ہوں۔یا اولاد کے دلوں میں وہ جذبہ کہاں جو والدین سے وابستہ رہتے ہوں۔آج کی دنیا میں خاندانی رشتے اور باہمی الفتیں کچے دھاگے بن گئے ہیں۔خاندان اور بزرگوں میں بھی نئی نسلوں یا چھوٹی فیملی میں زندگی گذارنے والے لوگوں کی پرشش کے طریقے بالکل بدل گئے ہیں۔رضوان احمد کی یہ کہانی اس دور کی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے 'دروازے'، میں اور 'مسدود راہوں کے مسافر' جیسے افسانوں میں انسان کے داخلی کرب کے ساتھ ساتھ نیوکلیر فیملی کے مسائل اور متوسط طبقہ میں مرکزی خاندان کے بڑھتے رجحان کو بحسن وخوبی اجاگر کیا ہے۔

ترنم ریاض ایسے دور کے افسانہ نگار ہیں جس میں نیوکلیر خاندانوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے اور وہ اس تیز رفتاری کی روش سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرکے زیادہ تر اسی موضوع پہ کہانیاں لکھ رہی ہیں۔خاص کر ذرائع ابلاغ اور

جدید ٹکنالوجی کے اثرات نے خاندان کی ہیئت بدلنے میں جو اہم کردار ادا کر رہے ہیں اور جس سے نئی نسل کو نئی دنیاؤں کا ادراک کم سنی میں ہی ہوتا ہے اور خاندان اس کے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ ترنم ریاض نے ان سبھی مسائل کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں مین یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ کیا ہندوستان میں خاندان اپنے فرائض ادا کر رہا ہے؟ ان فرائض میں افزائش نسل، جنسی راہ روی قائم رکھنا، معاشی ضروریات پورا کرنا، سماجی تربیت دنیا،، سماج میں حیثیت قائم کرنا، حفاظت کرنا یہ تمام فرائض ایسے ہیں جن سے بچنا کسی بھی نوعیت کے خاندانوں کے لئے ممکن نہیں۔ لیکن زمانے کے اعتبار سے ان فرائض میں ردو بدل کا امکان ہے یا نہیں، اس طرح کے جوابات کا ایک واضح خاکہ ان کے افسانوں سے عیاں ہوتا ہے۔ اور اس سے یہ پہلو اجاگر ہوتا ہے کہ معاشرے کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ان فرائض کا یکسر خاتمہ تو نہیں ہوتا لیکن بہت سی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔

''آدھے چاند کا عکس'' اس افسانہ میں ترنم ریاض نے نیوکلیر فیملی کے فرائض کی نوعیت کو مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ اس طور پر کہ مشترکہ خاندان میں بچوں کی تربیت کی ذمہ داری بہت اہمیت نہیں رکھتی تھی اور نہ ہی اس کے لئے کوئی التزام تھا، سختی اور نرمی کے ملے جلے انداز کے باوجود ہدایت کے لئے تحکمانہ طریقے اپنائے جاتے تھے نیوکلیر خاندان کا رجحان بڑھنے سے مشترکہ خاندان کے اس طریق کار میں بہت واضح تبدیلی ہوئی۔ وہ اس طرح کہ بچوں پر سختی اور نرمی کرنے کے مسئلہ پر غور کیا جانے لگا اور نرم طرز عمل وجود میں آیا۔ اس افسانہ میں عاطف کا کردار نرم روی میں پرورش پایا ہے۔ اس کے جذبات کبھی مجروح نہیں ہوئے ہیں یہاں تک کہ جب کم سنی میں ہی وہ عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس کے والدین اس کے خلاف کوئی ردعمل کا اظہار نہیں کرتے ہیں اور نہ ہی ضبط و تنظیم کا مطالبہ کیا۔ بلکہ وہ عاطف کو اپنے حال پہ چھوڑ دیتے ہیں اور عشق کے مختلف پہلوؤں کو گاہے بہ گاہے اس پر آشکار کرتے ہیں۔ سیر و تفریح کا سامان مہیا کراتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عاطف آزادانہ طریقہ سے ان پہلوؤں پہ غور کر کے خود فیصلہ کرتا ہے اور زندگی کے نشیب و فراز کی ذمہ داری قبول کرنے کا اہل بھی ہو جاتا ہے۔

اس کہانی میں عاطف جب عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس کے والدین اسے گرمیوں کی چھٹی میں تفریح کے لئے لے جاتے ہیں۔ وہاں ایک اور کنبہ موجود ہوتا ہے جس میں ایک لڑکی بھی ہے۔ عاطف کی اس سے دوستی ہو جاتی ہے اس کے بعد وہ لڑکی عاطف کو اپنے عشق کی داستاں بیان کرتی ہے۔ یہ داستان سن کر عاطف اپنے عشق کے بارے میں سوچنے لگتا ہے اور بالآخر اپنی محبوبہ کے کسی بوائے فرینڈ کے ہونے اور نہ ہونے کی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

> ''ماماں'' دھیرے سے بولے 'جی میرے بچے'' کیا ساحل کی دی دی
> (اس کی محبوبہ)...'' وہ سنجیدہ سے لہجے میں کچھ کہتے کہتے رکے.... میرا دل
> دھک سے رہ گیا۔ ''ساحل کی دیدی کا بھی کوئی بوائے فرینڈ ہوگا'' انہوں نے
> آہستہ سے پوچھا۔ ''ہاں بیٹا... ہوسکتا ہے... وہ بڑی ہے نا'' ''ہوٹل والی

دیدی سے تین چار سال چھوٹی ہے نہ'' ''مگر آپ سے بھی تین چار سال بڑی ہے نا'' ''ہاں...وہ تو ہے۔'' میں ان کی طرف پلٹی ...کچھ دو تین پل ادھر ادھر دیکھتے رہے پھر میرے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ ''میں ابھی آتا ہوں'' وہ اپنے کمرے کی طرف گئے۔ لوٹے تو ان کے ہاتھ میں وہ چاکلیٹ تھا جو انہوں نے چھٹیوں سے پہلے اپنی لکھنے کی میز کی دراز میں سنبھال کر رکھا تھا۔ آدھا توڑ کر میرے منہ میں ڈال دیا اور باقی خود کھانے لگے۔ ''شام کا اخبار آیا ہوگا نا'' انہوں نے کہا اور میرا جواب سننے سے پہلے ہی اخبار کی تلاش میں اچھلتے کودتے باہر بالکنی کی طرف گئے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔'' (۱۰)

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نیوکلیر خاندان میں بچوں کی تربیت اور حفاظت کرنا بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ جس میں نرمی پر مبنی انداز تربیت اگر چہ بچوں میں سوچنے کی صلاحیت کو اجاگر کرتا ہے مگر فیصلے کی درستگی کا حتمی نتیجہ مشکوک بھی نظر آتا ہے جیسے کہ اس افسانہ کا آخری جملہ ''میں نے خدا کا شکر ادا کیا'' سے ظاہر ہوتا ہے اس جملہ کے لہجے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح وہ عاطف کے سنبھلنے کا شکریہ ادا کرتی ہے اسی طرح نئی نسلوں میں پھیلنے والے بے جا عشق سے چھٹکارے کے لئے بھی شکر ادا کرتی ہے۔

اگر بیسویں صدی کی پوری افسانوی تاریخ کا جائزہ لیا جائے اور اس کے تدریجی ارتقا پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اردو کی افسانوی تخلیقات ابتدا ہی سے سماج اور معاشرے سے ہم آہنگ رہی ہے۔ اس کے بعد جیسے جیسے سماج اور معاشرے میں تبدیلیاں آئیں افسانے کے موضوعات اور تکنیک میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ زمانے کی بدلتی قدروں کے سبب چوں کہ ہماری خانگی زندگی میں تغیرات اور تبدیلی آتی رہی ہے، اس لیے اس کے شانہ بشانہ افسانے کے موضوعات اور ہیئت وساخت کی ڈھانچے بھی ادلتے بدلتے رہے ہیں۔ ہماری خانگی زندگی نے جتنی اور جس سطح پر کروٹ لی ہے، اردو افسانے نے بھی ہماری سماجی اور خانگی زندگی کی ان کروٹوں کو تعبیر کا پیکر عطا کیا ہے۔ ہماری خانگی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کو ہمارے افسانہ نگاروں نے اپنا مرکز خیال نہ بنایا ہو۔

حواشی

(۱) جیلانی بانو، پرایا گھر۔ص:۱۷۶۔۱۷۷

(۲) اقبال انصاری، گھر۔ص:۱۳

(۳) اقبال انصاری، گھر۔ص:۱۵

(۴) منہاز صدیقی، تقسیم ہند کے بعد اردو افسانوں کا موضوعات۔ص:۲۷

(۵) اردو کا افسانوی ادب۔ص:۳۱۴

(۶) سید محمد اشرف، ڈار سے بچھڑے۔ص:۵۸

(۷) رضوان احمد، طوفان کی زد پر۔ص:۳۵

(۸) رضوان احمد، طوفان کی زد پر۔ص:۳۵

(۹) رضوان احمد، طوفان کی زد پر۔ص:۴۰

(۱۰) ترنم ریاض، ابابیلیں لوٹ آئیں گی۔ص:۱۰

خاتمہ

ادب میں فطرت پسندی حقیقت نگاری انسان دوستی، مشترکہ خاندان کی جدید کاری، سماج کی تبدیلی کا دخل اس جدید شعور کے نتائج ہیں جو جدید ہندوستان میں مغربی اثرات سے پیدا ہوئے۔ ورنہ قدیم ادب کی بافت محض اعلیٰ طبقہ اور شہری زندگی کی کثرت تکرار سے بوجھل تھی۔ اردو افسانہ اسی جدید فکر و شعور میں ہونے والی تبدیلیوں کے باعث مورد وجود میں آیا۔

اردو ادب کی تاریخ میں افسانہ نگاری کو بڑی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ اس صنف نے اردو ادب کی تاریخ کو ایک نئی جہت عطا کی ہے اور ہندوستانی زندگی سے مختلف النوع موضوعات حاصل کر کے اپنی ایک الگ دنیا قائم کی ہے۔ افسانہ اگر چہ ارتکاز کا متقاضی ہوتا ہے اس میں واقعات کا کوئی ایک پہلو ہی پیش کیا جانا ممکن ہوتا ہے لیکن اس کے سیاق و سباق میں اتنی گنجائش ہوتی ہے کہ اسے مختلف زاویوں سے دیکھا اور پرکھا اور زندگی کے ہر شعبے اور سماجی و خانگی زندگی کے ہر مسائل کو ڈھونڈا جا سکے۔ افسانے کی کہانی خواہ کتنی ہی مجرد شکل میں کیوں نہ ہو حقیقت اور زندگی سے مجرد نہیں ہو سکتی۔ اس کے موضوعات اور اس کے کردار کسی نہ کسی حد تک زندگی سے متعلق ہونگے اور اس میں سماج اور خاندان کا تصور ضرور ہوگا کیونکہ ادب کا موضوع زندگی ہوتا ہے، تخلیق کار اپنی لسانی استعداد کی بنیاد پر محض اس کو مختلف معنی دیتا ہے۔

زندگی کی اس شکل کو جو اجتماعی ہو خواہ وہ سماج سے متعلق ہو یا خاندان سے، یا اس کا تعلق کسی مذہب، ملت اور تہذیب سے ہو یا مخصوص زمان و مکان سے اس کی جستجو اردو افسانوں میں کی جا سکتی ہے۔ بیسویں صدی کے افسانوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خانگی زندگی جس کا تعلق سماج اور معاشرے سے ہے اور جس کی یکجہتی میں انسانی زندگی کی ضروریات پوری ہوتی ہیں وہ معروضیات کے ایسے دائرے فراہم کرتی ہیں۔ جس کے مطالعے کیلئے مختلف طریقے اپنائے جا سکتے ہیں، اور بہت سے دلچسپ و اہم حقائق کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔

اردو افسانے کا عہد بہ عہد جائزہ لینے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں ہر دور کی خانگی زندگی کا تصور اور اس کی ہیئت اور ساخت جداگانہ شکل میں موجود ہیں۔ اولیں دور کے افسانے معاشرے کی بتدریج گذرتی ہوئی زندگی کے تسلسل کو اپنے موضوع میں شامل کر رہے تھے۔ اس وقت سجاد حیدر یلدرم، راشد الخیری، علی عباس حسینی اور پریم چند وغیرہ نے معاشرتی اور اصلاحی تحریروں کو پیش کیا اگر چہ ان میں رومانوی اثرات کے نمونے ملتے ہیں لیکن افسانہ جلد ہی اس سے آزاد ہوتا ہوا نظر آتا ہے اور زندگی سے اس کی ہم آہنگی نمایاں ہونے لگتی ہے۔ علی عباس حسینی کے افسانوں میں 'رفیق

تنہائی'، 'بہو کی ہنسی'، 'آئی سی ایس' اور 'سوکھی' ایسے افسانیں ہیں جن میں دیہات کی معاشرت اور خانگی زندگی پر مبصرانہ تحریریں موجود ہیں خاص کر پریم چند نے دیہاتی اور شہری زندگی کو جو اہمیت دی ہے اس سے متوسط طبقہ کے ہندو گھرانے اور ان میں ہونے والے روزمرہ کے واقعات کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔ نیز راشد الخیری کے متعدد افسانوں میں دہلی کے متوسط مسلمان گھرانوں اور ان کی خانگی زندگی کی پیچیدگیوں کی کامیاب تصویریں ہیں۔

اس دور کے افسانہ نگاروں میں پیش کش کا انداز بعد کے افسانہ نگاروں سے مختلف ہے، فنی اعتبار سے ان کے شعور کافی بلند ہیں لیکن کہانی کی واقعیت کا اظہار عمدہ نہیں، جہاں بھی مغرب و مشرق کے تصادم یا مغرب زدہ کسی کردار کا ذکر آتا ہے ان کے ذہن و دماغ پر خالص مشرقی خول چڑھ جاتے ہیں، مشرقی سماج اور خاندان کو بکھراؤ سے بچانے کے لئے مصنوعی حل ڈھونڈ لیتے ہیں اور موضوعات و کردار میں جب جدت و قدامت کی کشمکش پیدا ہوتی ہے تب ان کی تقلیب کر کے ان میں مشرقی ماحول جاگزیں کر دیتے ہیں۔

اس کے بعد ہندوستان پہلی جنگ عظیم کی براہ راست ہلاکتوں سے اگرچہ محفوظ رہا لیکن بالواسطہ طور پر اس کی دیہاتی اور شہری زندگی میں ایک نیا انقلاب آیا۔ صنعتی اور سائنسی ایجادات کے نتیجہ میں معاشعرے کے اندر انقلاباتی تغیرات رونما ہوئے، سرمایہ داروں اور مزدوروں کی کشمکش کا آغاز ہوا، متوسط طبقے کی تعداد میں اضافے ہوئے، ہندوستان کے اندر سیاسی اور طبقاتی تحریکیں ابھریں اور عوام میں آزادی کے جذبات موجزن ہوئے۔ جن سے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ساتھ ساتھ خانگی نظم وضبط میں بھی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ مثلاً قید و بند، جلوس واحتجاج، ظلم واستبداد، آدمی کی ضرورت وافادیت اور اس کا استحصال، ہجرت کے رجحان اور جدید و قدیم تہذیوں کے درمیان تصادمات ومفاہمت وغیرہ۔ ان سارے اسباب وعوامل کی وجہ سے ہندوستان میں خانگی زندگی کے نظم وضبط میں طرح طرح کے تغیرات واقع ہوئے۔ جن کا افسانوں میں بیان کرنا ناگزیر ہو گیا۔ نیز انہیں تغیرات کے زیر اثر افسانہ نگاروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، اختر اورینوی اور سہیل عظیم آبادی وغیرہ کے افسانوں میں ان حالات کا ذکر بخوبی کیا گیا ہے جن سے کہ زندگی کے بدلتے زاویے اور خاندان کی منتشر شکلیں اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ 1936 کے بعد کے افسانہ نگاروں نے فرد، خاندان، معاشرت، حکومت، اعلی اور ادنی طبقات اور سیاسی وانتظامی ہیئت کی مختلف النوع کیفیتوں کو اپنے افسانوں میں پرویا ہے۔ عصری زندگی کی داخلی اور خارجی پیچ وخم ان میں موجود ہیں۔ 1947 کا زمانہ مختلف النوع تبدیلیوں کا پیش خیمہ ہے۔ اس زمانے میں اردو افسانوں کے موضوعات یکسر ایک ایسی جہت کی طرف متوجہ ہوئے جو خالص ہندوستان اور ہندوستانیوں کی سازندہ تھی اس ملک نے دو بڑی عظیم جنگوں کی خون ریزی اور ہلاکتوں سے براہ راست اپنے آپ کو بچائے رکھا تھا لیکن کسے معلوم تھا کہ یہ کمی 1947 میں وہ خود اپنے ہاتھوں وطن کی تقسیم اور فساداتی خون ریزی کا جشن منا کر پوری کرے گا۔ اس سے پیدا ہونے والے خاندان کے بکھراؤ، ہجرت اور روایتوں کے انتشار نے خالصتاً ہندوستانی اقدار کو پامال کیا ہے۔

جس کے افسانے کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی ،عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، سعادت حسن منٹو، خواجہ احمد عباس، حیات اللہ انصاری، عزیز احمد، سہیل عظیم آبادی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، صدیقہ بیگم، اپیندر ناتھ اشک، قاضی عبدالستار اور دیگر فنکاروں کی تحریروں میں ضبط ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اردو میں فساد اور تقسیم ہند پر لکھے گئے افسانوں کی تعداد کسی دوسری ہندوستانی زبان کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر افسانہ نگاروں کی تعداد جیسے جیسے بڑھ رہی تھی صنف افسانہ میں بھی فن اور ہیئت کے اعتبار سے عمدگی پیدا ہو رہی تھی۔ اس دور کی کہانیوں میں متوسط طبقے کی زندگی اور شہری ماحول کی منظر کشی کا رجحان بڑھ رہا تھا اور پیش کش کے انداز میں بھی نمایاں فرق آنے لگا تھا، حقیقت نگاری کے پیرائے میں واقعات کی دوٹوک تصویر کشی اس عہد میں لکھی جانے والے افسانوں کی اہم خصوصیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان افسانوں میں سماجی اور خانگی زندگی کی شکلیں بالکل واضح نظر آتی ہیں۔

1960 کے بعد ہندوستان کے اندر سائنسی ،تکنیکی، تعلیمی، اور معاشی ہر میدان میں ترقی ہوئی اور سیاسی اور جمہوری نظام نے انسانی زندگی کو ایک نیا موڑ دیا۔ اس زمانے میں ہر انسان اپنی فطرت کے مطابق اچھا سے اچھا کرنے کی کوشش میں ابتداً اجتماعیت کو کھو بیٹھا اور پھر مربوط و منظم خاندان سے نیوکلیائی اور مرکزی فیملی میں پناہ گزیں ہوا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس کی انفرادیت بھی جاتی رہی اور محض مشینی تیز رفتاری کے اضطراب و انتشار کا شکار ہو کر موہوم ہیولیٰ اختیار کر کے سرگرداں رہنے لگا۔ رام لعل، احمد یوسف، قاضی عبدالستار، جوگندر پال، عبدالصمد، کلام حیدری، شوکت حیات، سلام بن رزاق، سید محمد اشرف، عابد سہیل، غیاث احمد گدی، مشرف عالم ذوقی، طارق چھتاری اور رضوان احمد وغیرہ کے افسانوی تخلیقات میں ان حالات کی تصویریں جا بہ جا ملتی ہیں۔

ادب میں ذات کے اظہار اور ذات کی تلاش کا رجحان پایا جاتا ہے، جدید افسانہ نگار اپنے جذبہ و خیال، فکر و تصور ،تجربہ و تخیل اور وجدان کی مدد سے اپنی کہانیوں میں ایک ایسی صورت حال تیار کرتا ہے جو اس کی اندرونی شخصیت تک محدود ہوتی ہے لیکن چونکہ فنکار کا ایک معاشرتی وجود بھی ہے اور اس کی داخلی دنیا کے نشیب و فراز بھی سماجی اور خانگی عطا کردہ ہے اس لئے فطری طور پر اس کی تخلیقات میں بھی سماجی معنویت ،معاشرتی بصیرت اور خانگی زندگی کی حقیقت کا موجود رہنا لازمی ہے۔ اردو افسانے کی چالیس سالہ زمانی وسعت میں چونکہ سماجی اور خانگی زندگی نت نئے نشیب و فراز سے گذرتی رہی ہے، مشترکہ خاندان میں انتشار پیدا ہوتا رہا ہے اور نیوکلیر فیملی کا رجحان پروان چڑھتا رہا ہے اس لئے افسانوں میں متفرق رجحانات و میلانات کا پایا جانا ضروری ہے۔

کتابیات

اطہر، پروین: اردو میں مختصر افسانہ نگاری۔علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، 2002

اطہر، پرویز: رام لعل کے منتخب (افسانے)، دہلی، ایجوکیشنل بک ہاؤس 1984

احمد، خورشید: جدید اردو افسانہ۔علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس 1997

احمد، شہناز: ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ، دہلی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس 2009

انصاری، اسلوب احمد: ادب اور تنقید، الہ آباد، 1968

انصاری، اختر: یہ زندگی، علی گڑھ، یونیورسٹی پبلیشر 1958

انصاری، حیات اللہ: شکستہ کنگورے، دہلی، آزاد کتاب گھر، کلاں محل 1955

احمد، عقیل: اردو ناول اور تقسیم ہند، دہلی، موڈرن پبلیشنگ ہاؤس 1987

احمد، شکیل: اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی، لکھنؤ، نصرت پبلیشر 1984

افراہیم، صغیر: اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس 2009

افراہیم، صغیر: اردو فکشن تنقید اور تجزیہ، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس 2003

افراہیم، صغیر: اردو کا افسانوی ادب، (تحقیقی اور تنقیدی مضامین) علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس 2010

اقبال، آصف: جدید افسانہ، تجزیہ اور امکانات۔دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 2007

انصاری، امین: اردو ناولوں میں سماجی مسائل کی عکاسی۔لکھنؤ، نصرت پبلشر 1988

انصاری، اقبال: گھر، دہلی، محمد شیراز انصاری پانڈونگر 2002

انور، مہناز: اردو افسانے کا تنقیدی مطالعہ، لکھنؤ پبلشر 1985

اختر، سلیم: افسانہ حقیقت سے علامت تک۔الہ آباد 1980

اشرفی، وہاب: بہار میں اردو افسانہ نگاری، بہار، اردو اکیڈمی بہار 1989

اعظمی، خلیل الرحمٰن: اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس 1979

بُد کی، دیپک: عصری تحریریں، (تنقیدی مضامین اور تبصرے) کشمیر، میزاین پبلشرز 2006

بیگم، رونق جہاں: اردو افسانے میں حقیقت نگاری، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس 2007

بیدار، عابد رضا: قومی تہذیب اور ہندستانی مسلمان، دہلی، جمال پرنٹنگ پریس 1969

بانو، جیلانی: نروان، دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ 1963

پال، جوگندر: کتھانگر (افسانے)، دہلی، مندا کالکا جی 1986

پاشی، کمار: نیا اردو افسانہ، دہلی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس 1980

پریم چند، منشی: واردات، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ 1955

جالبی، جمیل: ادب، کلچر اور مسائل۔ کراچی، رائل بک کمیٹی پاکستان 1986

جعفر، مہدی: نئی افسانوی تقلیب۔ دہلی، معیار پبلکیشنز 1999

جعفر، مہدی: نئے افسانے کا سلسلۂ عمل، گیا، دی کلچرل اکیڈمی 1981

جہان، اشرف: اردو افسانے کا بدلتا مزاج، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس 2010

جمیل، خاور: ادب کلچر اور مسائل، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس 1988

چند، تارا: قومی یکجہتی اور سیکولرزم، دہلی، انجام ترقی اردو ہند 1975

چند، تارا: ہندستانی کلچر کا ارتقاء، دہلی، شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی 1967

چندر، کرشن: ستاروں کی سیر، دہلی، ایشیا پبلیشرز 1961

چندر، کرشن: ایک روپیہ ایک پھول، دہلی، ایشیا پبلیشرز 1955

چندر، کرشن: اجنتا سے آگے، بمبئی، کتب پبلیشرز لمیٹیڈ 1947

چندر، کرشن: ٹوٹے ہوئے تار، دہلی، انڈین بک کمپنی 1947

حسن، جعفر: ہندوستانی سماجیات۔ علی گڑھ، انجمن ترقی اردو ہند 1995

حیدر، قرۃ العین: پت جھڑ کی آواز، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ 1970

حسین، سید عابد: قومی تہذیب کا مسئلہ، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان 1998

حسین الحق: صورت حال (افسانوی انتخاب) گیا، تاج پریس 1982

حسین، ثریا: انتخاب سجاد حیدر یلدرم، لکھنؤ، اتر پردیش اردو اکادمی 1988

حسینی، علی عباس: ندیا کنارے، دہلی، پبلیشر ڈویژن 1964

حسینی، علی عباس: ہمارا گاؤں اور دوسرے افسانے، لکھنؤ، اورینٹل پبلیشنگ ہاؤس نمبر۔3۔1956

حیدر، خالد: پریم چند کے افسانے (حقیقت نگاری اور دیہی زندگی) علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس 1999

حنفی، شمیم: جدیدیت کی فلسفیانہ اساس۔ نئی دہلی، مکتبہ جامعہ 1977

حسن، محمد: اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ۔ دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو ادب 1998

حیدری، کلام: بے نام گلیاں اور دوسری کہانیاں، رانچی، ملک کتاب گھر 1955

حیدری، کلام: گولڈن جبلی، گیا، دی کلچرل اکیڈمی 1983

خورشید الاسلام: اردو ادب آزادی کے بعد، علی گڑھ، شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی 1973

خسرو، سید علی محمد: اردو کی تہذیبی معنویت، نئی دہلی، کے۔ جی سیدین ٹرسٹ جامعہ نگر 1987

ذاکر، کشمیری لال: تجھے ہم ولی سمجھتے، دہلی، دہلی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، 2007

رئیس، قمر: نیا افسانہ، مسائل اور میلانات۔ دہلی، اردو اکادمی 2001

رئیس، قمر: نمائندہ اردو افسانے۔ دہلی، اردو اکادمی 2003

ریاض، ترنم: یہ تنگ زمین، نئی دہلی، مارڈن پبلشنگ ہاؤس 1998

ریاض، ترنم: ابابیلیں لوٹ آئیں گی، نئی دہلی، نرالی دنیا پبلی کیشنز 2000

رضوانہ: ۱۹۵۰ کے بعد اردو کی خواتین افسانہ نگار، نئی دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 2007

راج، رہبر ہنس: ترقی پسندی افسانے کا ایک جائزہ، دہلی 1967

ریحانہ، نکہت: اردو افسانہ، فنی و تکنیکی مطالعہ 1947 کے بعد۔ دہلی 1986

رضوی، مسیح الحسن: چوتھی بہن، لکھنؤ، ادارہ فروغ اردو 1966

رہبر، ہنس راج: اب اور تب، دہلی نیا دور پبلیشرز 1953

رفیع، انیس: کرفیو سخت ہے، مظفر پور، کتابستان، 2002

رفیع، انیس: اب وہ اترنے والا ہے، کلکتہ، کوہ نور آرٹ پریس پرائیویٹ لمیٹیڈ 1984

رضوی، منشاد جہاں: جدیدی اردو افسانے کا تنقیدی مطالعہ 1960 سے عصر حاضر تک۔ دہلی، جے کے آفسیٹ پریس 1994

سدید، انور: اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش۔ الہ آباد، اردو رائٹرس گلڈ 1983

سدید، انور: مختصر افسانہ عہد بہ عہد، لکھنؤ، اتر پردیش اکادمی 1992

سندرم، پی پاسوم: ترقی پسند تحریک، نیشنل بک ڈپو 1971

سلام بن رزاق: شکستہ بتوں کے درمیان، بمبئی، ایڈشاٹ پبلی کیشنز 2001

سری نواس، ایم این: جدید ہندوستان میں ذات پات، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان 2001

سنگھ، بلونت: ہندستان ہمارا، الہ آباد، سنگم پبلیشنگ ہاؤس 1947

سبحانی، شبنم: ہندستانی تہذیب اور اردو، علی گڑھ، سرسید بک ڈپو 1961

شاہین، شہناز: اردو افسانے پر مغربی ادب کے اثرات، دہلی، تخلیق کار پبلیشر 1999

شرما، رام شرت: ترجمہ۔ قاضی عبدالرحمٰن، سماجی تبدیلیاں، دہلی، مکتبہ جامعہ 1975

صدیقی، ابواللیث: آج کا اردو ادب۔ علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس 1990

صغیر، احمد: اردو افسانے کا تنقیدی جائزہ 1980 کے بعد۔ دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 2009

صدیقی، عظیم الشان: افسانوی ادب تحقیق و تجربہ، دہلی، نیو پبلک پریس 1984

صدیقی، عظیم الشان: افسانہ نگار پریم چند تنقیدی و سماجی محاکمہ، دہلی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس 2006

صادق: ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ 1936 سے 1956 تک، دہلی، نعمانی پریس 1981

علوی، وارث: جدیدی افسانہ اور اس کے مسائل۔ دہلی، نئی آواز جامعہ نگر 1990

علی، عبداللہ یوسف: انگریزی عہد میں ہندستان

عبداللہ، سید: اردو ادب کی ایک صدی، دہلی، چمن بک ڈپو 1997

عصمت، چغتائی: چھوٹی موئی، بمبئی، کتب پبلیشرز 1952

عباس، خواجہ احمد: پاؤں میں پھول، بمبئی، مکتبہ سلطانی 1948

عباس، خواجہ احمد: دیا جلے ساری رات، دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ 1959

عباس، خواجہ احمد: گیہوں اور گلاب، دہلی، ایشیا پبلیشرز 1965

عباس، خواجہ احمد: زعفران کے پھول، بمبئی، کتب پبلیشرز لمیٹیڈ 1947

عظیم، انور: اجنبی فاصلے، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ 1994

غیاث الدین، محمد: نذر قاضی عبدالستار، دہلی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس 2006

فاروقی، شمس الرحمٰن: افسانے کی حمایت میں۔ دہلی، مکتبہ جامعہ 1977

فاروقی، شمس الرحمٰن: افسانے کی حمایت میں، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ 1982

فتح پوری، فرمان: اردو افسانہ اور افسانہ نگار۔ دہلی، مکتبہ جامعہ 1982

فتح پوری، فرمان: اردو نثر کا فنی ارتقاء، دہلی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس 2009

فاطمہ، عزیز: سماجی و ثقافتی پس منظر، لکھنؤ، پبلیشرز 1984

قاضی، فردوس انور: اردو افسانے نگاری کے رجحانات۔ لاہور، ایف ڈی پرنٹرز 1990

قدوائی، شافع: فکشن مطالعات پس ساختیاتی تناظر، دہلی، دہلی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس 2010

قریشی، کامل: اردو اور مشکہ تہذیب۔ دہلی، اردو اکادمی 2000

قاسمی، ابوالکلام: آزادی کے بعد اردو فکشن، مسائل و مباحث۔ دہلی، ساہتیہ اکادمی 2001

کریم، ارتضیٰ: روشنی کی ضمانت (کلام حیدری کے منتخب افسانے) دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 1998

لعل، رام: اردو افسانے کی نئی تحقیقی فضا، نئی دہلی، سیمانت پرکاش 1985

لعل، رام: چراغوں کا سفر، دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ 1966

لعل، رام: آواز تو پہچانو، لکھنؤ، مکتبہ کہانی کار 1963

لعل، رام: خواجہ احمد عباس کے منتخب افسانے، دہلی، سیمانت پرکاشن 1988

منظر، شہزاد: جدیدی اردو افسانہ، کراچی، منظر پبلکیشنز 1982

محبی، جمیل اختر: فلسفۂ وجودیت اور جدیدی اردو افسانہ۔ دہلی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 2002

متین، اقبال: اجلی پرچھائیاں، حیدرآباد، مکتبہ صبا 1960

مل، جان اسٹوارٹ (مترجم: سعید انصاری)، آزادی، نئی دہلی، ترقی اردو بورڈ 1978

مین را، بلراج: مقتل، نئی دہلی، مارڈن پبلشنگ ہاؤس 2007

نیر، قیام: بہار میں اردو افسانہ نگاری ابتداء تا حال۔ پٹنہ، دی آزاد پریس (طبع دوم) 1996

نارنگ، گوپی چند: ادب کا بدلتا پس منظر اور مابعد جدیدیت۔ دہلی، اردو اکادمی 1998

نارنگ، گوپی چند: نیا اردو افسانہ انتخاب تجزیہ اور مباحث۔ دہلی، اردو اکادمی 1992

نارنگ، گوپی چند: بلونت سنگھ کے بہترین افسانے، دہلی، ساہتیہ اکادمی 1995

نارنگ، گوپی چند: اردو افسانہ روایت اور مسائل۔ دہلی، مکتبہ جامعہ 1981

نئی دھرتی پرانے گیت، نئی دہلی، فکر جدید 1958

وہاب، خان شاہد: اردو فکشن میں ہجرت، دہلی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس 2006

ہاشمی، قمر اعظم: عصری ادب کا شعور۔ دہلی، ادراک پبلیکشنز 1983

انگریزی کتب

Ahmad, Imtiyaz: Family Kinship and Marriage among the Muslims in India, New Delhi, Manohar 1976

Dobe, Leela:Sociology of Kinship, Bombay, Popular Parkashan 1974

Gore, M.S Urbanization in Family Change in India, Bombay, Popular Parkashan 1968

Kolenda, Pauline: Regional Defferences In Family Structure in India, Jaipur, Rawat Publication1987

Jawaharlal Nehru University Library